حلقہ مری زنجیر کا

فہمیدہ ریاض

شیخ ایاز کے منتخب سندھی کلام کا منظوم ترجمہ

. انسٹیٹیوٹ آف سندھیالوجی کے اشاعتی سلسلے کی کتاب نمبر ۶۰

حلقہ مری زنجیر کا

Rs 150.00

امداد و تعاون
(وزارت تعلیم و ثقافتی امور۔ حکومت پاکستان)
پاران : ایم ایچ پنھور انسٹیٹیوٹ آف سنڌ اسٽڊيز، ڄامشورو.

شیخ ایاز

(منظوم ترجمہ)

فہمیدہ ریاض



انسٹیٹیوٹ آف سندھیالوجی
سندھ یونیورسٹی ۔ جام شورو

سر ورق — آذر زوبی

پہلا ایڈیشن سنہ ۱۹۷۹ع
تعداد ۱۰۰۰

سول ایجنٹس
ادبیات
تلک چاڑھی - حیدرآباد سندھ
و
الماس بک ہاؤس
انورارٹی روڈ - پوسٹ باکس نمبر ۱۰۳۷۱
صدر - کراچی — ۳

اعجاز محمد صدیقی - مئنیجر - سندھ یونیورسٹی پریس - حیدرآباد سندھ نے طبع کیا اور ڈاکٹر غلام علي الانا، پروفیسر انچارج، انسٹیٹیوٹ آف سندھیالوجی - سندھ یونیورسٹی - جامشورو نے شایع کیا

حرف ناشر

چندِ ایک اعلیٰ تہذیبی اور ثقافتی مقاصد ذہن میں رکھ کر انسٹیٹیوٹ آف سندھیالوجی کی ابتدا کی گئی تھی، جو چھوٹے پودے سے بڑھ کر اب ایک تناور درخت بن چکا ہے۔ اس کے کافی ذیلی شعبے بھی ہیں جو اس علاقے کی ثقافت کے تحفظ اور اظہار کے سلسلے میں کام کر رہے ہیں۔

دیگر مقاصد کے ساتھ ساتھ اس ادارے کا ایک خاص مقصد یہ بھی رہا ہے کہ ملک کی سالمیت کے پیشِ نظر مختلف ثقافتوں اور زبانوں کو ایک دوسرے کے قریب لاکر ثقافتی ادغام کے عمل کو تیز کیا جائے۔ اس کیلئے یہ ضروری تھا کہ پاکستان کے مختلف علاقوں کے ادب کو ترجمے کے ذریعے ایک دوسرے کے قریب لایا جائے تاکہ ملک کے مختلف علاقوں کے لوگ ایک دوسرے کے جذبات اور احساسات کو سمجھ سکیں اور ذہنی قربت پیدا ہو سکے۔

اس مقصد کے تحت یہ ادارہ اس کتاب سے پہلے بھی شاہ عبداللطیف کے کلام کا منظوم اردو ترجمہ اور شیخ ایاز کی شاعری کا منظوم پنجابی ترجمہ شایع کر چکا ہے۔ اس کے علاوہ شاہ لطیف کے کلام کا پنجابی ترجمہ بھی تکمیل کے قریب پہنچ چکا ہے۔

شیخ ایاز اس دور کے ایک بڑے شاعر ہیں جن کے کلام کا منظوم اردو ترجمہ شایع کرنا اس ادارے کیلئے فخر کی بات ہے۔

ترجمے کی اہمیت اس وجہ سے بھی زیادہ ہے کہ مترجم اردو کی ایک اہم شاعرہ ہے۔

یہ ادارہ جہاں ادب، لسانیات، ثقافت، اقتصادیات اور سیاسیات کے متعلق انسٹھ (۵۹) کتابیں شایع کر چکا ہے، وہاں زیر نظر اعلیٰ مقاصد کے طور پر یہ شعری مجموعہ بھی پیش کر رہا ہے۔

آخر میں ہم یہ بتانا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ زیر نظر کتاب "حلقہ میری زنجیر کا" چھاپنے کے اخراجات حکومت پاکستان کی وزارت تعلیم و ثقافتی امور نے برداشت کئے ہیں جس کیلئے ہم ممنون ہیں۔

امید ہے کہ حکومت کی توجہ اور ہماری اس محنت کو علمی و ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

ڈاکٹر غلام علی الانا
پروفیسر انچارج
انسٹیٹیوٹ آف سندھیالوجی
سندھ یونیورسٹی۔

ترتیب

ڏَهَ ڀَروڙيان ڀَتَ جا ڪِينرَ منجهان ڪِي

(اے کاش! میں اس شعلہٴ ساز سے راہ وفا کو منور کر سکوں)

ـ شاہ عبداللطیف بھٹائی

شیخ ایاز سندھ کے محبوب ترین شاعر ھیں لیکن غیر سندھیوں کے لئے اب تک محض ایک مشہور شخصیت رہے ھیں۔ ان کے نام سے تو سب واقف ھیں لیکن کلام سے قطعی انجان ھیں۔ ایاز کیا کہتا ھے؟ اس کی سوچ کیا ھے؟ اس کے کلام کے شعری حسن کا کیا معیار ھے؟ یہ سارے سوال ابھی تک تشنۂ جواب رہے ھیں جن کے بارے میں لوگ سنی سنائی باتوں اور اپنے اپنے ظرف کے مطابق اندازے لگائے بیٹھے ھیں۔

انسٹیٹیوٹ آف سندھالاجی کی جانب سے ایاز کے کلام کے اردو ترجمہ کی یہ اشاعت اردو کے قاری سے ایاز کا پہلا تعارف ھے۔ زیر نظر کتاب ان سارے سوالات کا ایک حد تک جامع جواب ھے کیونکہ ترجمہ کرتے ہوئے پوری کوشش کی گئی ھے کہ قاری ایاز کے کلام کے معنی سے بھی واقف ھو سکے اور اس کے ظاھری پیکر کی رعنائی سے بھی۔ تا حال شیخ ایاز کے پانچ شعری مجموعے شائع ھو چکے ھیں جن کے نام یہ ھیں:

(۱) ڀنور ڀري آڪاس ——— (بھنورا بھرے اڑان)
(۲) ڪلھي پاتم ڪينرو ——— (کاندھے دھرا ساز)
(۳) ڪي جو ٻيجل ٻوليو ——— (جو بیجل نے کہا)
(۴) وڄون وسڻ آئيون ——— (بجلیاں برسنے آئیں)
(۵) ڪپر ٿو ڪن ڪري ——— (ساحل پر بھنور پڑے)

ان کا غیر مطبوعہ مجموعۂ کلام " لڙيو سج لڪن مين "

ایاز کی شاعری میں سندھ کی لوک داستانوں کے کرداروں کا ذکر بارھا ملتا ھے۔ ایاز نے ان کرداروں کو ان کے مشہور اوصاف کی بنیاد پر علامتی طور پر استعمال کیا ھے۔ مثلاً "مومل" جو حسن کے لئے مشہور تھی۔ "کاک محل" وہ جادو کا محل جو موسل نے تعمیر کرایا تھا۔ "سسی" کا کردار جو محبوب کے کھوج کی علامت ھے۔ "سوھنی" جو طوفانوں سے ٹکرا جانے کی ھمت کی طرف اشارہ کرتی ھے۔ یہ کردار بیشتر اردو قارئین کے لئے جانے پہچانے ھیں اور ان کی علامتی اھمیت سمجھنے میں کوئی دقت نہیں پیش آنی چاھیئے۔ سندھ کی لوک داستانوں میں ایک ایسا مخصوص کردار بھی ھے جو تسلسل کے ساتھ ایاز کی ساری شاعری میں بار بار نظر آتا ھے۔ یہ "بیجل" کا کردار ھے جو ایاز کی شاعری کا سب سے بلیغ استعارہ ھے۔ بیجل وہ گائک ھے جو اپنے راگ کے عوض سننے والے کا سر مانگتا ھے۔ اس لوک داستان میں راجہ رائے ڈیاچ نے بیجل کا راگ سنا تھا اور اس کے عوض اپنا سر نذر کیا تھا۔ اس طرح رائے ڈیاچ ایک دوسرا استعارہ بن کر ابھرا ھے جو سر کی صدا پر لبیک کہنے کی علامت ھے۔

ایاز نے بارھا اپنی شاعری میں گائک بیجل کا استعارہ خود لکھنے والے کے لئے استعمال کیا ھے۔ کہیں کہیں اس نے صرف گائک لکھکر بیجل کی طرف اشارہ کیا ھے۔ مثلاً

ترا چنگ گائک امانت کسی کی
کہیں سر سوادے نہ دوجی صدائیں

یہ اور اسی طرح کے استعاروں کو بیجل کی روایت سے آسانی سے سمجھا جا سکتا ھے۔

غزل کی صنف سندھی شاعری میں اردو شاعری کی مانند

مدت مدید سے استعمال ہوتی آئی ہے۔ شیخ ایاز نے غزل کے میدان میں خوب خوب طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی غزلیات ان کے مخصوص مزاج اور میلان طبع کے مطابق اردو کی غزلیات سے کافی مختلف ہیں۔ انہوں نے غزلوں کا لہجہ اپنی نظموں اور گیتوں کے لہجے سے مختلف نہیں ہونے دیا ہے۔ اس لئے قاری کو غزلیات میں بھی ایاز کا وہ ہی منفرد رنگ نظر آئے گا جو ان کے دوسرے کلام میں چمکتا ہے۔

ترجمے کی صحت اور تسلی بخش نمائندگی کے سلسلے میں یہ عرض ہے کہ شاعر زیرِ نظر ترجمے سے کافی مطمئن ہیں اور ان کا خیال ہے کہ ترجمہ بڑی حد تک ان کے کلام کے ساتھ انصاف کرتا ہے۔ بہرحال عرض مترجم یہ ہے کہ :

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

اگر یہ کلام آپ کو پسند آئے تو بس اتنا سمجھ لیجئے کہ مترجم اپنے الفاظ میں ایاز کی بے پناہ طاقتور شاعری کی چند سانسیں پھونکنے میں کامیاب ہوئی۔ اس ترجمے کو پڑھنے سے آپ محض یہ اندازہ لگاسکتے ہیں کہ ایاز کی اصل شاعری کس بلا کی شے ہوگی۔ بہتر تو یہی ہے کہ ترجمہ پڑھکر اصل کو پڑھنے کی پیاس بھڑکے اور آپ سندھی سیکھ کر خود اس بپھرتے سمندر کی سی شاعری کی شناوری کریں جو ایاز نے دس پندرہ برس کے مختصر عرصہ میں تخلیق کی ہے۔ تب قارئین واقعی پرکھ سکتے ہیں کہ ایاز کا کلام برصغیر کے ہم عصر شعراء کی مجموعی تخلیقات میں کتنا اعلیٰ مقام رکھتا ہے۔ ایاز ان کمیاب شعراء کی صف میں آتے ہیں جو انسان کے نازک سے نازک اور درشت سے درشت جذبات کو موثر ترین شعری شکل دینے پر قدرت رکھتے ہیں۔

هجر ہو یا وصال، بزم ہو یا رزم، طنز کی تیکھی دھار ہو یا نوحے کی سسکی، ایاز شعر کے موضوع میں اس طرح پگھل جاتا ہے کہ اس کا کلام سراسر کسی بھی جذبے کا منہ بولتا پیکر بن جاتا ہے۔ اس کے گیتوں میں ساون کی جھڑیاں لگ جاتی ہیں، وایوں میں حکمت و فرزانگی کے خزانے بھرے ہیں اور نظموں کا بہاؤ پہاڑی ندی کی طرح تند و سرکش ہے۔ وہ چاہے پیار کا راگ چھیڑے یا جنگ کا، اس کا وجدان اظہار کے لئے ایسی پرکار لے ڈھونڈ لیتا ہے کہ پڑھنے والے کا خون اس کی تال پر رقص کرنے لگتا ہے۔

میں نے ایاز کی شاعری کو دیکھا تو ایسا ہی پایا۔ کیا میں آپ کو بھی اس کا روپ دکھاسکی ہوں ـــ؟ اس کا فیصلہ تو آپ ہی کریں گے۔ مجھے تو اتنا کہنا ہے کہ اگر میں اس سب رنگی دھنک کا دھندلا سا خاکہ بھی اتارسکی ہوں تو میں اپنی کوشش سپھل سمجھوں گی۔

فہمیدہ ریاض
کراچی

۲۵۔ اکتوبر ۱۹۷۷ع

گیت اور وائیاں

"وائی" کے معنی "بات" کے بھی ھیں اور "پکار" کے بھی — یہ ھمیشہ کسی نہ کسی "سُر" میں لکھی جاتی ھے اور اس کے مصرعوں میں ایک داخلی ربط موجود رھتا ھے۔ غزل کے اشعار کی طرح اس کے مصرعوں میں الگ الگ مضامین بھی باندھے جاسکتے ھیں اور اسمیں مطلع اور مقطع کا التزام بھی رکھا جاسکتا ھے، لیکن "وائی" کی تکنیک "غزل" سے مختلف ھوتی ھے۔ اس میں ایک مصرعہ بار بار دھرایا جاتا ھے جو فضا کی ھم آھنگی اور کیفیت کی شدت کو ظاھر کرتا ھے۔ ارتقائی منازل طے کر کے وائی "مستزاد" کی صورت بھی اختیار کر گئی ھے لیکن گذشتہ سو برس سے سندھی شعرا نے اس صنفِ سخن کو ھاتھ نہیں لگایا۔ جدید شعرا میں شیخ ایاز پہلے شاعر ھیں جنھوں نے نہ صرف پیرایۂ اظہار کے لئے اسے منتخب کیا بلکہ اسے کچھ اور بھی آگے بڑھایا اور اسے جدید فکر سے ھم کنار کیا۔



اب تو سورج ڈھل رہا ہے
پربتوں میں
شل ہوئے ہیں پیر تھک کر
پھر بھی کوئی چل رہا ہے
پربتوں میں
ریت کے ٹیلے کے اوپر
وہ دیا جو جل رہا ہے
پربتوں میں
اک نئے سورج کا سپنا
اس کے اندر پل رہا ہے
پربتوں میں
آنے والا دن ابھی سے
اپنی آنکھیں مل رہا ہے
پربتوں میں



آ رہے زنداں کے جھروکے سے نہار
کتنی پیاری رات ہے
گر رہی ہے آسماں سے چاندنی کی آبشار
کتنی پیاری رات ہے
کر رہی ہے دوجہاں پر وار کوئل کی پکار
کتنی پیاری رات ہے
یہ ہوائیں ، سامنے لمبی کھجوروں کی قطار
کتنی پیاری رات ہے
چاند بھی سیخوں سے تجھکو جھانکتا ہے بار بار
کتنی پیاری رات ہے
ناچ سکتا ہے گھڑی بھر اپنی زنجیروں میں یار
کتنی پیاری رات ہے
گا رہے پیارے، یہ در و دیوار کب ہیں پائیدار
کتنی پیاری رات ہے



میںہار آیا، میںہار ری
میںہار ری
کنٹھا گلے میں، کانوں میں بالے
پربت سے آیا اس پار ری
میںہار ری
موتی لٹائے، جوتی لٹائے
کیا کیا سجائے، سنسار ری
میںہار ری
چوڑا* دکھائے، جو لوٹ جائے
چھوری کا سارا سنگھار ری
میںہار ری
بانہیں گلے میں، آہیں گلے میں
پہنائے مالا، بل دار ری
میںہار ری
گھونگھٹ ہٹائے، جھومر ٹکائے
کیا کیا بڑھائے، بیوھار ری
میںہار ری
ھے ھے ری سکھیو، مت سنگ رکھیو
اس کا تو سب سے ھے پیار ری
میںہار ری

---

* چوڑا — بڑی چوڑی

اس کو ہے جانا، کہنا نہ مانا
لو باگ موڑے، ھسوار* ری
میمنہار ری
انکھیوں نہ اڑنا، دوجے سے جڑنا
روئے نہ روکا، میمنہار ری
میمنہار ری

* ھسوار — گھوڑے سوار، آسوار



ری ہائے، میرا جیا رے
ہائے ہائے، میرا جیا رے
رت آئی ہے گلاب کی
سب نے پہنے ہار، ہوا میں لٹ لٹ مہک رہی ہے
رت کی ریت نرالی ہے، رگ رگ میں چہک رہی ہے
پر وہ میرا پیا رے
ہائے ہائے، میرا جیا رے
رت آئی ہے گلاب کی
کوک کوک کر گھائل من میں کوئل کسے پکارے
بار بار آؤں چوکھٹ پر سپنے کئی سنوارے
کب بھید آن کا دیا رے
ہائے ہائے، میرا جیا رے
رت آئی ہے گلاب کی
کسی کو اس کا پتہ نہیں ہے موت کسے کب مارے
نا جانوں مرے پیچھے دوجا جلائے گا جو دوارے
راہی کے لئیے دیا رے
ہائے ہائے، میرا جیا رے
رت آئی ہے گلاب کی



پیلا بن دیکھے
کوئل کوکے

کل تھی پیڑ پیڑ میں وینا
گونگا بن دیکھے
کوئل کوکے

میگھ ملارو، میگھ ملارو
ماندہ من دیکھے
کوئل کوکے

پیلا بن دیکھے
کوئل کوکے



سولی پر منصور دیکھ، کر نیر بہائے تو کیا
اس پل سچ کا ساتھ، نہ دوگے
پچھتاؤ گے
دوش اٹھا کر پھر گھبرائے تو کیا
پھول جو پیڑا میں کمہلائے
مورکھ، ھائے
پتی پتی پھر یاد آئے تو کیا
اس پل ساتھ، نہ دوگے آکر
بادل بھر بھر
روز نہ آتے، پھر تم آئے تو کیا



آزادی ــ انسان ، سمجھو ایک ہی بات ہے
گر تو غرض غلام ہو ، ہے ہے ! تو حیوان
سمجھو ایک ہی بات ہے
واہ وا ! روٹی پیاز سے ، گر مکھ پر ہے مان
سمجھو ایک ہی بات ہے
آزادی بن آدمی ، کنکر کاٹھ سمان
سمجھو ایک ہی بات ہے
جس کو لاج کا پاس ہے ، وہ انسان مہان
سمجھو ایک ہی بات ہے
منگی سمجھا ، چن لیا ، کیوں میں نے زندان؟
آزادی انسان ــ سمجھو ایک ہی بات ہے



دیا جلا ، دیا جلا
دیپ تری دھرتی دھتکارے، تو ھی بچا
دیا جلا ، دیا جلا
گھر گھر مرگھٹ کا سناٹا ، دھیر بندھا
دیا جلا ، دیا جلا
سوامی باتی ماند پڑی ھے، جوت بڑھا
دیا جلا ، دیا جلا



مدھ مستی ہے، مدھ مہنگا ہے، مر کا سودا کون کرے
موکھی بیٹھی گھڑا بھرے
پلا ری امرت پھلنے والا، بس کی تیکھی تار چلے
موکھی بیٹھی گھڑا بھرے
سب کے بس کی نہیں یہ مدرا، کوئی کوئی یہ گھونٹ بھرے
موکھی بیٹھی گھڑا بھرے
جان بوجھ کر چلے متارے*، سر کاندھوں پر بار لگے
موکھی بیٹھی گھڑا بھرے

* سندھی میں متارا کڑیل جوان کو کہتے ہیں - "موکھی اور متارے" سندھ کی لوک کہانی ہے۔ موکھی (موکش دینے والی، نجات دھندہ) ایک کلال تھی اور متارے اس کے میخانے پر روزانہ مے نوشی کے لئے آتے تھے - موکھی کے ایک خم میں سانپ چلا گیا تھا اور وہیں مر گیا تھا - ایک رات جب شراب ختم ہوگئی تھی اور متارے سیر نہیں ہوئے تھے، انہوں نے وہ زہر آلود خم بھی نوش کر لیا جس میں سانپ مر گیا تھا اور ایک انوکھے سرور میں آگئے اور پو پھٹنے سے پہلے ہی مر گئے -



سچ میں اور سپنے میں دوری، جو بھی مٹائے
بول، میں اس کی باندی ری

سچ صدیوں کا گیت کے اندر جو بھی سمائے
بول، میں اس کی باندی ری

دل دریا ہے، ساگر اتھلا، تھاہ دکھائے
بول، میں اس کی باندی ری

کیا کیا روپ ہیں اس پنچھی کے، اور جو گائے
بول، میں اس کی باندی ری



تٹ تٹ پر طوفاں، الو میاں*
ناؤ چلی ہے گیت لئے
کھڑے نہ کھویّا، ڈگمگ نیّا، سانجھی سرگرداں، الو میاں
ناؤ چلی ہے گیت لئے
گھاٹ بیچ گھنگھور گھٹا میں آج کھڑا انساں، الو میاں
ناؤ چلی ہے گیت لئے
اک بنجارا، بھاگوں مارا، نیہہ کرے ناداں، الو میاں
ناؤ چلی ہے گیت لئے

---

* آلو میاں — سندھی میں تخاطب کا ایک انداز



گھایل گبھرو، نت نت آئے
جم جم آئے رے......

لال بنے مرے دیس کے
لال بنی نے دوارے دوارے
ھنس کے کیس بچھائے رے

لال بنے مرے دیس کے
ان پہ تن من واری واری
بیری مار گرائے رے

لال بنے مرے دیس کے
لال لہو میں میرے بنے نے
گاؤں گلے لگائے رے

لال بنے مرے دیس کے
لال بنے مرے نت نت آئے
جم جم آئے رے......



ھائے ری، کت جاؤں ری میں، کسی کل نے، کسی ریت
مورے من کو آئے نہ چینا
ھائے ری، یہ کیسی رینا، چندا بھی نہیں مورا میت
مورے من کو آئے نہ چینا
چھوڑی ری، گلابی وہ رت، مو سے روٹھ، گئیو مورا گیت
مورے من کو آئے نہ چینا
کوئی ہار، مانے ہار نہیں، کوئی جیت ری کیسی جیت
مورے من کو آئے نہ چینا
سجنا، تو کہاں ھے رے؟ کہاں ھے رے تیری پریت
مورے من کو آئے نہ چینا
ھائے ری، کت جاؤں ری میں، کسی کل نہ کسی ریت
مورے من کو آئے نہ چینا



رو رو رین گزاری ری
ہائے رو رو رین گزاری ری
اپنا پیار پکھیرو جیسا، سارے لوگ شکاری
ہائے رو رو رین گزاری
میں پیاسی، میں گھائل گھائل، تپتی دھرتی ساری
ہائے رو رو رین گزاری
جن کا گیت ہوا سے ہلکا، ان پر دھرتی بھاری
ہائے رو رو رین گزاری
ہائے برا بھنبھور نہ جانے، گزری کون سواری
ہائے رو رو رین گزاری
گیت مجھے دیکر تونے یہ سولی کا ہے سنواری
ہائے رو رو رین گزاری



او آرائیں
تیری جھولی کیا کیا پھول ؟
بیلا سائیں
آیا دلہن کے مکھ پر جھول
او آرائیں
تیری جھولی کیا کیا پھول ؟
دوھا سائیں
پیار لٹایا، کیسی بھول ؟
او آرائیں
تیری جھولی کیا کیا پھول ؟
آنسو، سائیں
پی لی ہے دھرتی کی دھول
او آرائیں
تیری جھولی کیا کیا پھول ؟
پیارا سائیں
سوکھ گئے ہیں اب تو ببول
او آرائیں
سرخ گلاب بھی آئیں گے؟
ہاں ہاں سائیں
سرخ گلاب کھلائیں گے



مجھ سے کب تک آنکھ رکھوگے چرائے
میں تو تیری آہ ہوں
تجھ میں جلتی ہوں نہ تو پہچان پائے
میں تو تیری آہ ہوں
او رے میرے گیت تو گائے نہ گائے
میں تو تیری آہ ہوں
او رے اپنے آپ سے تو کیوں لجائے
میں تو تیری آہ ہوں



دان نہیں دی دات *
مول چکایا ہے میاں
یہ جو قید قبول کی، اٹھ کر آدھی رات
مول چکایا ہے میاں
دیکھ اندھیری قید میں، چمک رہا پربھات
مول چکایا ہے میاں
میں ترازو تول کر، منہ پر لایا بات
مول چکایا ہے میاں
اجل گیا ہے آگ سے، گیت نے پائی گھات
مول چکایا ہے میاں

---

* دات ــ تخلیقی قوت



بھڑک رہے ہیں آنگن آنگن راگ ہمارے راگ ہمارے

نین نین چنگاری چٹخی آگ الاؤ سارا تن من
بھڑک رہے ہیں آنگن آنگن راگ ہمارے راگ ہمارے

سانس تپے ہے، کوئی میٹھا ناؤں جپے ہے بھٹکے بن بن
بھڑک رہے ہیں آنگن آنگن راگ ہمارے راگ ہمارے

شعلہ شعلہ سارا عالم، جگ مگ جگ مگ سارا جیون
بھڑک رہے ہیں آنگن آنگن راگ ہمارے راگ ہمارے

گاؤں گاؤں جلتی جوالا، سلگ اٹھے ہیں سب جن من گن
بھڑک رہے ہیں آنگن آنگن راگ ہمارے راگ ہمارے



تو جو آئے رات، الاہ او رات
تو میری رات امر ہو جائے گی
تو جو آئے میت تو یہ سنگیت امر ہو جائے گا
میرا من اس جوت کو دے کر جیت امر ہوجائے گا
پر گر کھائی مات، الاہ او مات
تو میری مات امر ہو جائے گی
تو جو آئے ڈھول، تو سر سر سلگ اٹھیں گے بول
جھم جھم جن میں جھمک اٹھے گی بات مری انمول
لبِ پر آیا گیت، الاہ او گیت
تو من کی بات امر ہو جائے گی
تن من تیری بھینٹ، نچھاور تجھ پر میرا راگ
پیتم میں تیری آھوتی، تو ہے میری آگ
تجھ کو دیکھے دات، الاہ او دات
تو اس کی گھات امر ہوجائے گی



اندھیارے گھاٹ پہ دو دیپک
کس لئے تکیں
ساگر کی اور
کوئی نیّا پلٹ کے آئی نہیں
پھر اندھیارے میں دو دیپک
کس لئے تکیں
ساگر کی اور
کچھ کہے کوئی، دھڑکا ہے یہی
جیتے تو ہیں وہ مانجھی اب تک
اس لئے تکیں
ساگر کی اور
اندھیارے گھاٹ پہ دو دیپک



سجن بسیں اس پار

او منوا سجن بسیں اس پار

اتر پتن پر آئی سانجھی، ہوئی نہ نیا پار
من مانجھی بن کب آئے گا وہ من کے منجدھار

کا ہے کیا رہے پیار؟

او منوا سجن بسیں اس پار

کبھی کبھی گھر آئی بدریا، مگر نہ کی بوچھار
رن کی رات ہے بستی ساری، چار کھونٹ اندھکار

سونے سب گھربار

او منوا سجن بسیں اس پار

کبھی تو آئے گا وہ چندا، جگ مگ ہو گی رات
ساری ساری رات کریں گے میٹھی میٹھی بات

آ جائے اک بار

او منوا سجن بسیں اس پار

من پہ اپنے دکھڑے کرتے کاری کاری وار
پھر بھی ان کا ہمیں بھروسہ، ان کی ہمیں سہار

ان کی ہی مہکار

او منوا سجن بسیں اس پار



دور نہ اتنا گھاٹ رے مانجھی
ہولے ہولے لے چل نیّا
پانی کی چھاتی چھلکائے
نیّا جب ہچکولا کھائے
جیسے پل پل کروٹ بدلے
کاری کاری باٹ رے مانجھی
ہولے ہولے لے چل نیّا
بہتے دھارے، جلتے تارے
بادباں کے سائے کارے
آئیں پل پل یاد وہ پیارے
جگ مگ جیسے لاٹ* رے مانجھی
ہولے ہولے لے چل نیّا
اپنے پیا پردیس سدھارے
اب کوئی یار نہ میت ہمارے
من کی پہیلی کوئی نہ بوجھے
سب کی باتیں کاٹ رے مانجھی
ہولے ہولے لے چل نیّا

---

* لاٹ ــ دیئے کی لو



بنجاروں کو نہیں بھلا
رات تو راھی بیت جائے گی
کیسی دوری، دل ھی دل میں چھپر ان کے ساتھ لگا
رات تو راھی بیت جائے گی
من ھی من میں تو چنتا کو سنگ سنگ منزل تک لا
رات تو راھی بیت جائے گی
آتے آتے سمجھ آئے گی، سنیں گے میٹھی تری صدا
رات تو راھی بیت جائے گی
کبھی تو یہ زنداں ٹوٹیں گے، کبھی تو بیری ھارے گا
رات تو راھی بیت جائے گی



منزل تیری دور مچھیرے
رات اندھیری آ پہنچی
رات اندھیری آ پہنچی رے، کونج کنارے جا پہنچی
ڈوب گیا وہ دور ستارا
اس اندھیارے کا اجیارا
گھور گگن میں کون سہارا
انگ انگ ہے چور مچھیرے، رات اندھیری آ پہنچی
رات اندھیری آ پہنچی رے، کونج کنارے جا پہنچی
کونج انہیں سندیس یہ دینا
وہ دوڑے آئیں گے، کہنا :
کٹے گی کیسے ہائے عمر یا
رہے جو تم سے دور، مچھیرے، رات اندھیری آ پہنچی
رات اندھیری آ پہنچی رے، کونج کنارے جا پہنچی
ساجن کا وہ روپ کھلا ہے
بن بن میں جو مہک رہا ہے
دیکھ، وہ پہنچے، دیکھ، وہ پہنچے
دیکھ، سامنے گھور مچھیرے، رات اندھیری آ پہنچی
رات اندھیری آ پہنچی رے، کونج کنارے جا پہنچی



زور لگا کر دینا رے پتوار کا پھیرا، کھیون ہار
گھاٹ پرے ہے

آگے پڑتا بھنور کے اندھیاروں کا گھیرا، کھیون ہار
گھاٹ پرے ہے

دریا کی لہروں کا ابھی گھمسان گھنیرا، کھیون ہار
گھاٹ پرے ہے

ٹکرا دے طوفان سے یہ خوں رنگ پھریرا، کھیون ہار
گھاٹ پرے ہے



کیسا نام دھراؤں؟ بول میں کیا کہلاؤں؟
مین ہوں بھٹائی، مین ہوں درازی، انہی کا نیہہ نبھاؤں وو*
مدرا پییوں اسی معنی کی، سامی نام دھراؤں وو
راکھہ میں ڈھونڈ رہا چنگاری، آگ نئی بھڑکاؤں وو
اسی صدا پر لپکوں یارو، سولی سیج سجاؤں وو
مین ہوں جوانی، میں ہوں جوالا، جگ جگ کو جھمکاؤں وو
چیروں پھاڑوں جھوٹ پرانے، سو سو قلعے گراؤں وو
ترے لئے لے آؤں سپنے، عرش ہزار اڑاؤں وو
سب کا جی جھولے میں جھلاؤں، اپنی نیند گنواؤں وو
دیس بدیس نہ میرا کوئی، آپ میں سب کو سماؤں وو
جیون میں جوگی ہوں تیرا، تیری کتھائیں گاؤں وو
تیری پل پل کی پیڑا کو، گیتوں میں سمٹاؤں وو
ترے لئے بن پیت بھکاری، دھرتی! صدا لگاؤں وو
دھرتی میرا دیس، مگر مین سندھ پہ پران لٹاؤں وو
بول میں کیا کہلاؤں؟

---

* سندھی زبان میں یہ لفظ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے



دیکھ رہے ہیں پل پل بکتی ناری بیچ بزار
میاں یہ ناری بیچ بزار
کپڑے جن کے رنگ برنگے ہونٹ چاشنی دار
میاں یہ ناری بیچ بزار
مکھڑے لگیں محل مومل کے، انگیا ہے اسرار
میاں یہ ناری بیچ بزار
ہر کانے کو رانے جیسا روپ دیا کلدار
میاں یہ ناری بیچ بزار
کسی کی بانچھ، کھتوری بانٹے، من جس سے بیزار
میاں یہ ناری بیچ بزار
بنی بھنبیری اڑے کسی کی گانجا پی گفتار
میاں یہ ناری بیچ بزار
کسی جیب سے بھریں سلامی کلجگ کے کرتار
میاں یہ ناری بیچ بزار
روپ روپ کا مول پرکھتی برہ کرے بیوپار
میاں یہ ناری بیچ بزار
کوکھ، جنی کے لئے کیا تھا ماں نے سوچ بچار
میاں یہ ناری بیچ بزار
کسے خبر تھی وقت کرے گا لوری پر للکار
میاں یہ ناری بیچ بزار



اندھا گگن، اندھیری دھرتی، گبھرو دیپک لاٹ
ہماری چار کھونٹ چمکاٹ*

زنداں کی دیواریں ڈھونڈیں، چھوڑ دیا گھر گھاٹ
ہماری چار کھونٹ چمکاٹ

موڑ موڑ ناگوں کے کنڈل، پڑیں نہ قدم اچاٹ
ہماری چار کھونٹ چمکاٹ

گیت گلابی پُروا پُروا، رم جھم رم جھم باٹ
ہماری چار کھونٹ چمکاٹ

* چمکاٹ — سندھی میں چمکاہٹ کے معنوں میں مستعمل ہے



بادل رے، بادل رے، میرے نین نہ، تھمنے پائیں
گرج گرج گھنگھور گھٹائیں، گگن پہ ابھری آئیں
میرے نین نہ تھمنے پائیں
کریں مری سکھیاں اٹکھیلیاں کھل کھل ہنستی جائیں
میرے نین نہ تھمنے پائیں
جھولے میں دن جھولیں، رتیاں آئیں بیتی جائیں
میرے نین نہ تھمنے پائیں
بنی بانوری پات پات میں ڈھونڈیں کیسے ہوائیں
میرے نین نہ تھمنے پائیں
اس بھیگے بھنبھور پہ بوندیں برس برس لہرائیں
میرے نین نہ تھمنے پائیں
کون نگر لے گئیں پنہل* کو آدھی رات بلائیں
میرے نین نہ تھمنے پائیں
کیسے سنگی ویرانے میں برہن کو بسرائیں
میرے نین نہ تھمنے پائیں

---

* پنہل — پنوں، سسی کا محبوب



سنگری* نہ پھلتی، کیکر نہ پھولے
ہریالی بھولے
گلے نہ چھیلے
مارو† اکیلے
مارو اکیلے

منہہ میں نوالے، کڑوے کسیلے
اور گال پیلے
آنسو کے ریلے
مارو اکیلے
مارو اکیلے

پت جھڑ کی سب رت، اک چپ کا جنگل
کیا پیر منگل
مکھڑے نہ میلے
مارو اکیلے
مارو اکیلے

دل چیر جائیں، کتنا رلائیں
جس وقت گائیں
کنچھی کویلے‡
مارو اکیلے
مارو اکیلے

---

* سنگری — ایک خوشبودار درخت کا پھل
† مارو — ریگزار تھر کے باشندے، ہم وطن
‡ کنچھی کویلے — بے موقع گانے والے پرندے



بھور سمے کے بانورے
مہندی بیج نہ کھیت میں

ہوں گی لال ہتھیلیاں
مریں گے گبھرو سانورے
مہندی بیج نہ کھیت میں

کاک * بلاوے آئیں گے
بسر جائے گی چھاؤں رے
مہندی بیج نہ کھیت میں

بھور سمے کے بانورے
مہندی بیج نہ کھیت میں

* کاک — سندھ کی لوک کہانی "مومل رانو" کی ہیروئن مومل کا طلسماتی محل



کیری نہیں ٹٹول ، رے چھورے
تپتے دن میں

جیٹھ، دوپہری، بھاری ڈال نندامی گہری
بور بور مت کھول ، رے چھورے
تپتے دن میں

ساون بس میں ، آم آم آئے گا رس میں
رت سوا ، بن مول رے چھورے
تپتے دن میں

کیری نہیں ٹٹول ، رے چھورے
تپتے دن میں



ہائے پہاڑی بیریاں *
ہائے وہ گھائل انگلیاں

سارا سمے بہار میں
ہر ہر پھول نکھار میں
ہائے پہاڑی بیریاں
ہائے وہ گھائل انگلیاں

یوں تو لگتے ہیں پیارے
اس رت کے سپنے سارے
ہائے پہاڑی بیریاں
ہائے وہ گھائل انگلیاں

---

* پہاڑی بیریوں کے بیر سرخ اور لذیذ ہوتے ہیں



گھر گھر جوت جلائی
سانجھی* آئی
تو نے دیپ بجھایا کیوں ری
مکھ تیرا کمھلایا کیوں ری
سب نے سیج سجائی
سانجھی آئی
وہ جو کبھی نا لوٹ کے آئے
تیری پریت اسی کو چاہے
کیسی گت یہ بنائی
سانجھی آئی
یہ آنکھوں میں ڈورے تیرے
ہائے نین کٹورے تیرے
بوند نہ جن میں سمائی
سانجھی آئی
کن سے پریت لگائی مورکھ
آج جو راس نہ آئی مورکھ
ساون کی پُروائی
سانجھی آئی

---

* سانجھی ـ سانجھ ـ شام



میں تو سپنا بیل لگاؤں
پھول کھلیں گے کب ، کیا جانوں

میں یہ گیت تجھے دیتا ہوں
ہاں تو میرا مرہم مل
گھاؤ بھریں گے کب ، کیا جانوں

میں نے توڑا جھوٹ کا پیالہ
تو بھی بس ہی پی کر چل
نشے گھٹیں گے کب ، کیا جانوں

پل بھر پاس ترے ٹھہرا ہوں
تھام مری گھوڑی اس پل
پہر ڈھلیں گے کب ، کیا جانوں



کل بگیا میں پھول نہ تھے

دیکھ یہ ڈالی ڈالی پر
کیسے راتوں رات کھلے

کل بگیا میں پھول نہ تھے

کل سونی تھی پھلواری
پت جھڑ کے سناٹے تھے

کل بگیا میں پھول نہ تھے

دیکھ یہاں شبنم روئی
دیکھ وہاں ہنس دیں کرنیں

دیکھ وہ پت جھڑ بیت چلا
کل جب کوئی پھول چنے

جو پت جھڑ میں کام آئے
کاش انہیں بھی یاد کرے



گرج گرج اے گونگی دھرتی بھرج گرج بھٹیانی*
بھرج گرج بھٹیانی
بھور سمے نے مینھ کی چنری رین تلک رے تانی
بھرج گرج بھٹیانی
جھر جھر تیرا شور اٹھے اور کڑ کڑ بجلی بانی
بھرج گھرج بھٹیانی
کارونجھر† میں آج پکارے پل پل پریت پرانی
بھرج گرج بھٹیانی
دھوپا* دور نہ رہ پائے گی اتھل پتھل میں پانی
بھرج گرج بھٹیانی

---

* بھٹیانی اور دھوپا — ریگزار تھر کی دو بارانی نہریں، جو کارونجھر پہاڑ کے دامن میں بہتی ھیں
† کارونجھر — ریگزار تھر کا ایک پہاڑ



ہے کوئی اتہاس ؟ گائک تیرے چنگ میں
ساری جنتا مانگتی ، کیوں یوں تیرا ماس ؟
ہے کوئی اتہاس ؟
بادل میں جھل مل تری ، تارے، ہو نہ اداس
ہے کوئی اتہاس ؟
بڑھے گا بن کی بیل سا ، نیہہ، نہ ہوگا ناس
ہے کوئی اتہاس ؟



یہ تھوھر کا پیڑ، ارے جیون

کبھی اٹھیں گھنگھور گھٹائیں برس پڑا ساون
ہائے وہ اس کی پھیلی بانہیں، ہائے وہ بے کل من

وہ پھوھار ھلکی ھلکی، وہ بوندوں کی چھن چھن
جان پڑی ڈالی ڈالی میں، لہریں لیتا من

پل بھر بجلی موڑ کاٹ کر جگا گئی برھن
گہرائی میں لہرائی اک صحرائی ناگن

جھن جھن بکھرا، جھم جھم چمکا بدلی کا سب دھن
نین میں جھانکے نشے کے ڈورے، گانے لگی پون

دور دور تک جیسے جگ مگ ھو اٹھا جیون
ہائے وہ برھن کا مسکانا، ہائے وہ مدھر ملن

پل بھر میں سورج کی نیا پہنچی پاس پتن
پھر تو وھی تھی تیز تپت اور پل پل وھی جلن

نا کوئی پھول کھلا رے اس میں، نا کوئی پینگھ مگن
یہ تھوھر کا پیڑ، ارے جیون



تجھ سے دور نہیں ہوں پیارے
تجھ کو مجھ سے روز ملائے
سندھو کا سپنا

میری جوت لئے جل دھارا
تجھ تک دمکاتی لے جائے
سندھو کا سپنا

کالی رات بپھر کر ابھرے
آئیں نگلنے کالے سائے
سندھو کا سپنا

پر یہ تارے، نین ہمارے
جن میں بیٹھا جوت جلائے
سندھو کا سپنا



تو جو لایا تھال سجائے
اتنے مہنگے مول کے سپنے
ایسے میوے
کون خریدے، کون خریدے؟

دیکھ، تو ہے کیا حال یہاں کا
من من ہے کنگال یہاں کا
تیرے سپنے
کون خریدے، کون خریدے؟

جن کے اندر امرت جل بھی
بات بھی ہے اور جنمیں بل بھی
ایسے دوھے
کون خریدے، کون خریدے؟



تیتر دیکھے جال
جوبن دو دن کا

آجا رنگیں ہتھیلیاں، جھکی رہے مہندی ڈال
جوبن دو دن کا

مہنا دیتی رت تجھے، بیتے کہیں نہ سال
جوبن دو دن کا

گوری، سدا نبھائیں ناں، کسی سے کالے بال
جوبن دو دن کا



دے دے، دے دے، موندھے گیت
پل پل ہے اک پیالا، آ
پی پی، پی پی، کل کیسا
اندھیارے پہرے کی جیت
آدھی رات اجالا، آ
بھر بھر، بھر بھر، کل کیسا
کھِل کھِل کونپل کونپل گیت
رت کرتی متوالا، آ
چن چن، چن چن، کل کیسا
جیون جیسا میرے میت
نہیں ہے کوئی شوالا، آ
پی پی، پی پی، کل کیسا
جی جی، جی جی، کل کیسا



منوا کرے پکار، او یار
او پردیسی
تیرے روپ نے کردی رم جھم
چھایا میگھ ملار، او یار
او پردیسی
بھینی بھینی یادیں جیسے
بیلے کی مہکار، او یار
او پردیسی
بات بھی تیری مصری جیسی
چپ بھی مدھ کی دھار، او یار
او پردیسی
میرے لئے گھڑی کا گھنگھرو
جگ جگ کی جھنکار، او یار
او پردیسی
نیا نہیں سنگیت ملن کا
ملے سدا سے تار، او یار
او پردیسی
تیرے میرے روزِ ازل سے
کتنے قول قرار، او یار
او پردیسی



چاہیں تری ہزار، او یار

آج تمنا تن میں آئی
پیت نے آج جھلک دکھلائی
چھایا میگھ ملار، او یار

آج تو پیاسے روزِ ازل کے
تیرے ہونٹوں تک جا پہنچے
پیاس بجھائے پیار، او یار

آج تو سوئے راگ جگائے
تن کے تاروں کو تڑپائے
میرا سانس، ستار، او یار

من ساگر پرچھائی سانجھی
گھور اندھیرا، میرے مانجھی
جس کا آر نہ پار، او یار

تو میرا میں تیرا ساحل
کب تک اپنے بھاگ میں سانول
موجیں اور منجدھار، او یار
چاہیں تری ہزار، او یار



جاری دکّن پون ، نیند میں ہیں نین
ہیں ہواؤں میں گیتوں کی دھیمی دُکھن
نیند میں ہیں نین
جھولتا ہے جیا، جھولتا ہے گگن
نیند میں ہیں نین
سانت کی دھار میں تیرتی ہے کرن
نیند میں ہیں نین
چاند کی ناؤ میں آج مانجھی مگن
نیند میں ہیں نین
پار سے آ رہے ہیں سجیلے سجن
نیند میں ہیں نین
جاری دکّن پون، نیند میں ہیں نین



عشق بنا آرائیں*، آیا اپنی جھولی بھرے
پھر کیا کوئی کرے
موتی سی مسکان، سجن کی مگرا مات کرے
پھر کیا کوئی کرے
جگ مگ جگ مگ میت ہمارا، جوبن آنچ کرے
پھر کیا کوئی کرے
جس کے کیس چنبیلی جیسے، مہکی سیج بھرے
پھر کیا کوئی کرے
جس کے شیتل نیناں جیسے رن میں رات پڑے
پھر کیا کوئی کرے
پل پل پر جو پیار کمل بن، کومل ہاتھ، دھرے
پھر کیا کوئی کرے
اوری سکھی میں ان بن جی لوں ! کیسی بات کرے
پھر کیا کوئی کرے

---

* آرائیں — سندھی میں آرائیں باغبان کو کہتے ہیں۔ بسنت رت میں آرائیں گھر گھر بیلے کے پھول لاتے ہیں اور منہ مانگے دام پاتے ہیں



انکھیاں بھیگ ھی جائیں گی یار، سارا درد دکھائیں گی یار
ساون اپنا سوانگ رچائے، کیسے پیت چھپائیں گی یار
انکھیاں بھیگ ھي جائیں گی یار
رت کی ریت نرالی ٹھہری، یہ تو بھر بھر آئیں گی یار
انکھیاں بھیگ ھی جائیں گی یار
ھوک سجن کی، رات سجن بن، تارے گنتی جائیں گی یار
انکھیاں بھیگ ھی جائیں گی یار
یاد کی مالا موتی موتی، آنسو کیوں نہ بہائیں گی یار
انکھیاں بھیگ ھی جائیں گی یار
ھوک ھوک کر اور سجن کی، اڑتی اڑتی جائیں گی یار
انکھیاں بھیگ ھی جائیں گی یار



ترے لئے ترسا بہت، موھن میرا ماس
نا جا رے، نا جا پیا . . .

مہندی رچی ہتھیلیاں، چوٹی گوندھی باس
نا جا رے، نا جا پیا . . .

انگنا چندن کا دیا، مد ماتا آکاس
نا جا رے، نا جا پیا . . .

گال لگا دے گال سے، سانس میں بھر دے سانس
نا جا رے، نا جا پیا . . .

کاہے پہنا گیروا، چھوڑا لوک لباس
نا جا رے، نا جا پیا . . .



جہاں تہاں وہ دیکھتے مجھ کو، جن سنگ جان جڑی
سکھی ری، جن سنگ جان جڑی

آج ہماری مدھ میں گھلے ہیں بن کر نیر لڑی
سکھی ری، جن سنگ جان جڑی

ساجن اپنی پیالی میں تھے جس پل رات پڑی
سکھی ری، جن سنگ جان جڑی

ان کی یاد بناری سکھیو، بیتی نہیں گھڑی
سکھی ری، جن سنگ جان جڑی

منوا اپنا اس کے بس میں ان سنگ آس اڑی
سکھی ری، جن سنگ جان جڑی

توڑ کے دیکھی، توڑ نہ پائی، ان کی قرب کڑی
سکھی ری، جن سنگ جان جڑی



گہرے گہرے نین ، سجن کے کارے کارے نین

انتیس کا اندھیارا جیسے
ریشم سارے نین

آیا ان میں نیہہ تو نکلے
سب سے نیارے نین

کُھل گئے آج مری مدرا میں
بن اجیارے نین

من پھلوا پر ڈول رہے ہیں
بھنورے کارے نین

گہرے گہرے نین ، سجن کے کارے کارے نین



جگ کی ریت نہ میں جانوں
میں تو آنچل پاؤں دھروں
جو تو رات رہے
میری چوڑی روپا پھول
جھانجھر بن کر بجا کروں
جو تو رات رہے
میرے گاؤں لال لباس
اوڑھ چندریا میں آؤں
جو تو رات رہے
کس کی ہے ایسی مسکان
جھر جھر موتی جھول بھروں
جو تو رات رہے
دے کر پونم جیسا پیار
کھاٹ پہ ساری رات کھیلوں
جو تو رات رہے
ہو جو تجھ کو لو کا ڈر
بدلی بن کر چھاؤں کروں
جو تو رات رہے



اوری کجری گجر*، پیر ہولے سے دھر
ھائے گاگر نہ چھلکے کہیں
مور اس چال پر بانورے ھو گئے
مورنی سے نہ، یوں مانوری ریس کر
پیر ھولے سے دھر
ھائے گاگر نہ چھلکے کہیں
تیرے چرخے کے تکلے نے گھائل کئے
کتنے گبھرو، اری، پھونک اتنے نہ گھر
پیر ھولے سے دھر
ھائے گاگر نہ چھلکے کہیں
پو پھٹی، لاکھ سے بھور چنری رنگے
لاج ڈھہری بھلی کامنی اس نگر
پیر ھولے سے دھر
ھائے گاگر نہ چھلکے کہیں
دیکھ، مکھڑا ترا، کہہ بھی پائیں نہیں
ھائے گاگر نہ چھلکے کہیں

---

* گجر — سندھی میں خوبصورت عورت کو کہتے ھیں



کاتک رینا، پورنما میں یہ پنہاری کون ؟
بھور سمے سے پہلے نکلی ہے یہ ناری کون ؟
سب سے نیاری کون؟
یہ پنہاری کون؟

بکھرے کئی وچار ہوا میں
اوس بھری مہکار ہوا میں
دبی دبی جھنکار ہوا میں

ہے یہ پیاری کون؟
لوک لجاری کون؟

رہٹ سے کاہے گال لگائے
نیر بہائے، بیٹھی گائے
کس کی کارن نین بچھائے

برھا ماری کون؟
یہ بےچاری کون؟



کیڑو کیڑو* — کاھے کرے
کسے پکارے† کارا؟
پیڑ تلے میں دوب پہ لیٹی
نیند اڑائے تو مرجائے

یاد دلائے یارا
کسے پکارے کارا ؟
کون چیرتا تیرا منوا ؟
تیرا چینا کون گنوائے؟

تجھے بھی کوئی پیارا؟
کسے پکارے کارا؟
یاد دلایا بسرا ناؤں
پریت سجن کی کون نبھائے

ھائے کہاں بےچارا !
کسے پکارے کارا ؟
کسے پکارے کارا ؟

---

* کیڑو کیڑو — تیتر کی آواز
† کارا — سندھ کا کالا تیتر



روئے سے جو رہ جاتے پیتم، میں نینوں نیر نہ روکتی ری
میں نیر بہا کر گاتی ری
میں پگ پگ کیس بچھاتی ری
گھر بار کو ان پر وار سکھی
میں سو سو سوانگ رچاتی ری
روئے سے جو رہ جاتے پیتم ، میں نینوں نیر نہ روکتی ری
مجھ سے بچھڑا میرا ساتھی
گھنگھور گھٹا بن چھا جاتی
میں ساری باٹ مٹا دیتی
میں ایسی برکھا برساتی
روئے سے جو رہ جاتے پیتم ، میں نینوں نیر نہ روکتی ری
اس بیراگی کو جانا تھا
کب کہنا میرا مانا تھا
اک رات رہا، گیا دور پیا
بہنا یہ دن بھی آنا تھا
روئے سے جو رہ جاتے پیتم ، میں نینوں نیر نہ روکتی ری



دیس چھوڑ پردیس میں بھٹکے ، لگن مری دیوانی ری
لگن مری دیوانی ری
مـــن جپتا ہے کس کی مالا، کون گلے میں گانی* ری
لگن مری دیوانی ری
یاد نے بٹ کر پیت کی ڈوری، سارے تن میں تانی ری
لگن مری دیوانی ری
نیہہ ندی ما لہریں مارے، لہر لہر مستانی ری
لگن مری دیوانی ری
پورا چاند نہیں ہے ایسا ، جیسا میرا جانی ری
لگن مری دیوانی ری
کوئی نہ روکے، کوئی نہ ٹوکے نیہہ نہیں نادانی ری
لگن مری دیوانی ری

* گانی ــ سندھ کی ایک مخصوص مالا



گوری ، پرو نہ کیتکی
گجرا پہن نہ بانہہ میں

پگلی سارے گاؤں میں
چھپ چھپ کس کو ڈھونڈتی
گجرا پہن نہ بانہہ میں

تٹ پر تاروں کے تلے
ہوک یہ کس کی یاد کی؟
گجرا پہن نہ بانہہ میں

سوچ رہی اس پار سے
آئے گی تیری پالکی
بھولی! کیسی پالکی
گجرا پہن نہ بانہہ میں



گگن گھاٹ پر ناؤ
چندا ابھر رہا

گھر گھر مہکی مالتی
چوڑی چوڑی چھاؤ
چندا ابھر رہا

کندن روپا کامنی
کام دیو کا گھاؤ
چندا ابھر رہا

سانجھی بیلا یاد کے
کیا کیا بنے سبھاؤ
چندا ابھر رہا



ہائے یہ کھلتے گال کنول
ہائے رے جوبن راڑ کرے

نچنی دوجی بار نہ آئے، ہائے یہ پائل جیسے پل
ہائے رے جوبن راڑ کرے

دن بھر جھر جھر برسا ساون، تھما ہے سانجھ، پڑے بادل
ہائے رے جوبن راڑ کرے

کس کی باٹ پہ کنڈلی مارے، اس کالے کی کس کو کل
ہائے رے جوبن راڑ کرے



تجھ میں مجھ میں بھید نہ کوئی، او رے ندی کے نیر
او رے ندی کے نیر
میں تو خود ہوں کسی جگت کی سندرتا کا نیر
او رے ندی کے نیر
چندر کامنا من میں ڈالے آدھی رات لکیر
او رے ندی کے نیر
گھلے دکن پُروئیا جیسی چاہت مرے سر پر
او رے ندی کے نیر
تجھ کو مجھ کو راس نہ آئی اس دھرتی کی دھیر
او رے ندی کے نیر



واپس موڑ مہار، میاں تو واپس موڑ مہار
کیوں الانگ آیا وہ یادیں، وہ پونم سا پیار
میاں تو واپس موڑ مہار
کیا سوچا جو اتار پھینکا، چت سے چندن ہار
میاں تو واپس موڑ مہار
سیج مہکتی چھوڑ کے نکلا، اوڑھے کون وچار
میاں تو واپس موڑ مہار
کس الجھن کو سونپا تو نے، تن کی طلب کا پیار
میاں تو واپس موڑ مہار
کس منزل کی موہ سے لاگی تیری نین نہار
میاں تو واپس موڑ مہار
دل دھلاتے پربت آگے، پگ پگ بیری وار
میاں تو واپس موڑ مہار
ٹک کے نہ بیٹھے، ڈھارس دیتا تجھے کون جی دار
میاں تو واپس موڑ مہار
بنے نہ تیری گر دنیا سے، مت کھو جی کا قرار
میاں تو واپس موڑ مہار



کاھے کیچ* چلا، پنہل تو لوٹ کے آ
رمتی رات نہ رھتی رانول†، چکھہ جیون مایا
پنہل تو لوٹ کے آ

ھوگا پھر بھنبھور‡ کہاں، مجھ بسری کے گھر آ
پنہل تو لوٹ کے آ

اس چھاتی میں بڑے چاؤ ھیں، ان پر تیر چلا
پنہل تو لوٹ کے آ

یہ جگ وہ جگ مجھ سے جھل مل، میں تری پورنما
پنہل تو لوٹ کے آ

---

* کیچ — سندھی کہانی 'سسی پنوں' کے ھیرو پنوں کا دیس
† رانول — سندھی میں محبوب کو کہتے ھیں
‡ بھنبھور — سسی کا گاؤں



جب چندا جھرنے میں نہائے، کنول کنول شرمائے
مانت، کنواری کنیا، میرے ہردے کو للچائے
میرے من میں کوئی مراری بن بن بین بجائے
نیل گگن کی کٹی گوپیاں
جن سنگ راس رچائے

ناری جب میرا من موہے، جگ سندرتا بھائے
اترے کوئی تاروں سے اور ندیا پر لہرائے
میں پکڑوں وہ پر کھولے، اڑ جائے بدن چرائے
کوئی بھید نہ پائے اسکا
کوئی بھید نہ پائے



ٹھہر، اے حسنِ ازل
آج میری آتما کی پیاس بجھتی ہی نہیں
ٹھہر، گھونگھٹ تو ہٹا مکھ سے ذرا دوچار پل
ٹھہر، اے حسنِ ازل
یہ ہوا، یہ رات اور یہ آرزو دل میں اٹل
ٹھہر، اے حسنِ ازل
چاند، تیرے منتظر ہیں میرے نینوں کے کنول
ٹھہر، اے حسنِ ازل
ٹھہر کچھ، تو سیر ہو لیں میرے نیناں چار پل
ٹھہر، اے حسنِ ازل
آج میری آتما کی پیاس بجھتی ہی نہیں



میں کوئل تو کالی رات
تجھے پکاروں، تجھے پکاروں
تو ہی گاتا پیارے سائیں
میرے روئیں روئیں کے ساتھ
تجھے پکاروں، تجھے پکاروں
کیسے کوکوں بھروں اڑانیں
تجھ بن میری نہیں نجات
تجھے پکاروں، تجھے پکاروں
من یوں ڈھونڈے تجھ کو جیسے
پیاسا بن ڈھونڈے برسات
تجھے پکاروں، تجھے پکاروں
تو ہی میرے سکھ کا سپنا
تو ہی جیون دکھ کی بات
تجھے پکاروں، تجھے پکاروں
میں کوئل تو کالی رات



کہاں ھے میری منزل، سائیں* ! پگ پگ جلتی آگ

رات اندھیری، بیلا گھری

چاند ستارے، میرے بیری

کبھی تو ھم سے آ مل، سائیں ! بھولے میرے بھاگ

کہاں ھے میری منزل، سائیں ! پگ پگ جلتی آگ

کب تک چپو مار سکوں گا

لہروں سے کب تلک لڑوں گا

دِکھے نہ کوئی ساحل، سائیں ! جل پر چھایا جھاگ

کہاں ھے میری منزل سائیں ! پگ پگ جلتی آگ

ساتھ، ترا ھے سنگ ترا ھے

نیہہ ترا ھے ننگ ترا ھے

مرے سفر میں شامل، سائیں! ھیں تیرے بھی راگ

کہاں ھے میری منزل، سائیں ! پگ پگ جلتی آگ

---

* سائیں ــ سندھی میں احترام کا تخاطب



تو مجھ کو ، میں تجھ کو ڈھونڈوں
لک چھپ* کھیل کھلاؤں
پیاس تری بھڑکاؤں
آگ ازل کی آگ ، ازل کی
آ میں تجھ کو گاؤں
سر میں سانس سماؤں
ساری رات سجن میں سوچوں
تاروں کو ٹھہراؤں
کیا کیا بھید بتاؤں
سو سو درد جگا کر تڑپوں
تجھ کو بھی تڑپاؤں
روم روم برماؤں
چندا میں ہوں تیری چندنیا
سایا بن پچھتاؤں
تجھ کو کیسے پاؤں

---

* لک چھپ — آنکھ مچولی



سمجھی تو کیا ہے سنسار؟

ہوگی شام، شفق چھائے گی
لہر لہر چھلکا جائے گی
چپکے چپکے
دھیمے دھیمے
گن گن گیت ندی گائے گی
پنکھ، کھول کر
بول بول کر
سارس اڑ جائے گی پار
گونج کرے گی بس جھنکار
سمجھی تو کیا ہے سنسار؟

کونج افق میں رلتے رلتے
ساتھیِ ڈھونڈھ رہی دن ڈھلتے
چکرائے گی
تھک جائے گی
پت جھڑ کی پھر پون چلے گی
بیج چھنٹے گا
کھیت چنے گا
جل تھل ہوگا تاروں تار
دانے سے ہوگ انبار
سمجھی تو کیا ہے سنسار؟

ھوگا ساون کا بوچھارا
یاد آئے گا پل پل پیارا
کالی راتیں
اور برساتیں
اٹھے گا بادل کارا کارا
گھن گھن گھن گھن
موتی چھن چھن
ٹوٹے گا بوندوں کا ھار
بوند نہ بوند کی رھتی یار
سمجھی تو کیا ہے سنسار؟

پل چھن تیرا میرا میلہ
پل بھر روح کرے گی ریلا
جب سناٹا
چھا جائے گا
تو بھی اکیلی، میں بھی اکیلا
یہی جہان
سب کچھ جان
سب کچھ پورنما اور پیار
اس کے آگے ہے اندھکار
سمجھی تو کیا ہے سنسار؟



کیسا غیب شہود
سب کچھ، تو ھی تو
چندا بھی چاکر ھے تیرا
سورج کرے سجود
سب کچھ، تو ھی تو
پار عدم کو کر کے آیا
تیرے لئے وجود
سب کچھ، تو ھی تو
تو ھی ھے اپنی منزل
اور تو ھی لامحدود
سب کچھ، تو ھی تو



کہاں سے اڑتا آئے پکھیرو؟
کون ہے اس کا دیس؟
وہ آکاش میں اڑنے والا دور نکل جب آیا
اس پاپی نگری میں کس نے پنجرے بیچ پھنسایا
اک سندر سپنا سی لاگی سارے جگ کی مایا
سارا جیون بہتے پانی پر پونم کی چھایا
بھول گیا وہ سب کچھ، کون ہے اپنا کون پرایا
کبھی کبھی آکاش سے اس کو کوئی بلاوا آیا
کبھی کبھی چندا نے آنکھوں آنکھوں میں سمجھایا
کبھی تلے تاروں کے اس نے گیت پرانا گایا
کئی دفعہ پنجرے میں اس نے اپنا پر پھڑکایا
آخر پنجرہ توڑ، کسی نے تالی مار اڑایا
بنا پروں کے اڑا پکھیرو
گیا بدل کر بھیس
کہاں سے اڑتا آئے پکھیرو؟
کون تھا اس کا دیس؟

دوہے اور بیت

"بیت" کا لفظ سندھی شاعری میں عربی اور فارسی سے مستعار ہے لیکن سندھی شعرأ نے ابیات کو دو مصرعوں تک محدود نہیں رکھا بلکہ چار پانچ یا اس سے زیادہ مصرعے بھی لکھے ہیں۔ سندھی بیت میں قافیے کا استعمال سورٹھے کی طرح ہوتا ہے۔ "سورٹھا" اس دوہے کو کہتے ہیں جس میں قافیہ مصرعوں کے درمیان لایا جائے۔ بیت میں قافیے کے اس التزام سے نہ صرف زور بیان پیدا ہوتا ہے بلکہ لہجے میں غنائیت بھی آ جاتی ہے۔

وائی کی طرح شیخ ایاز نے بیت کو بھی نئی زندگی دی ہے اور اکثر مسلسل بیت اس انداز میں لکھے ہیں کہ ایک مکمل نظم وجود میں آ گئی ہے۔ اسکے علاوہ انہوں نے اس صنف کو کلاسیکی موضوعات سے نکال کر عہد جدید کے افکار کا آئینہ بنا دیا۔

دوہے

ہے تیری باتوں کی میری یادوں میں گونج
جیسے چھوڑ بسیرا اپنا ابھی اڑی ہے کونج

جب جب نین میں آنسو چھلکے سارا دکھ، دھل جائے
ایسے نکلے بات تری جوں ہنس تلاؤ پہ آئے

تم سے بھلا کیا کہیں پڑوسن گھایل من کی بات
چڑا ہوا ہے چندا ہم سے روٹھ، گئی ہے رات

دور چلیں کچھ، پیت بڑائیں چھوڑیں چلتی باٹ
آ رے کسی بدلی پر سجنا لے چل اپنی کھاٹ

سجن نہ آیا، ساون آیا، ڈنک لگائے مینھ
بادل برسے، نیناں ترسے، نار بہائے نیہہ

پیارے پیارے لوگ وہ سارے جن کے میٹھے ناؤں
آئے چھائے میرے من پر بن بدلی کی چھاؤں

ہائے بچھوڑا* مار چلا اب گھڑی گھڑی ہے گھاؤ
کبھی تو سنگ ہمارے بیٹھو، ہنس کر بھوجن کھاؤ

---

* بچھوڑا — (بچھڑنا) جدائی

نیر ڈھلے ان گالوں پر تو ڈھل گئی کاجل دھار
گھاؤ کر گئی کتنا گہرا، کھا کر زنگ کٹار

نظر نظر منڈلاتی آئی، کھلنے لگی بہار
ھونٹ سجن کے ایسے جیسے ہو کچی کچنار

تم سنگ پیت لگا کر جگ سے چھوٹا اپنا من
جیسے ڈوڑا پات بسارے ھرا بھرا سب بن

پیار نہ جانے پار سکھی ری جہاں بھی اٹکے جی
ورنہ کیچی* کو کیا جانے دھوبی کی بیٹی†

سجن نہ آیا، ساون آیا، چھائی گھٹا گھنگھور
کب تک پھرا کرے گا بیکل میرے من کا مور

کیس بکھیرے تال پہ بیٹھی کیسی سندر نار
اجلے اجلے تن سے اتارے گدلا گدلا پیار

گاگر چھلکی گھگھرے بھر اور بہکی الھڑ چال
کن انکھیوں سے کسی نے دیکھا انگ انگ کا حال

---

* کیچی — کیچ کا رہنے والا، پنوں
† سسی دھوبی کی بیٹی تھی

پیار نے ماری برچھی من میں اب بیٹھے پچھتاؤ
صدیاں اسے نہ بھر پائیں گی گھڑی نے ڈالا گھاؤ

پیر میں کڑیاں، گیت لبوں پر، مدھ میں بھیگا بھیس
کیا مرضی ہے؟ گائک، تجھ کو کہیے بانورا، دیس

پیاسی، پیاسی، آس لگائے، پگ پگ پر رنجور
میری اکھیاں، ڈری ھرنیاں، تکیں افق میں دور

مست ودھاتا! لیکھ میں میرے لکھا یہ کیا سندیس
میرے سپنے کے امرت کو دے دیا بس کا بھیس

گیانی تیرے گیان گھونٹ سے گھٹے گی میری پیاس
میرا من ہے مانسروور، اتھلی ہُن کی آس

گھڑی گھڑی گلدان ہے جس میں رنگ برنگے پاپ
بھنورا بن کر جس پر ڈولے آج مرا آلاپ

یہ پورنما، مدھ ماتا من، یہ شیتل آکاش!
امرت رس ھوگیا ہے گوری تیرا میرا ماس

چتر کاڑھتا تیرے سندر روپ پہ پورا چاند
پون جھکولا، مدھر ھنڈولا، ندیا ھلکی ماند

ھیں گردن میں میری گوری، تیری گوری بانہیں
سو گئیں جیسے پورنما میں میرے من کی آھیں

اگر جیئے تو یونہی رھے گا سندرتا کا سنگ
کبھی نہیں اترے گا مکھ سے اس مدرا کا رنگ

پانی میں جب ننھا کبوتر اپنے پنکھ پھیلائے
دیکھ دیکھ اس کو، اس من کی الجھن سلجھی جائے

پیڑ پیڑ کو گلے لگا کر میں نے کہا ھے بھائی
پات پات کی گونج تمہاری، میرے من تک آئی

برکھا رت کی بھور سمے یہ اوکھلیوں کی اوٹ
کون دھمکتا جائے من کی گہری گہری چوٹ

دور دیس کے راھی، تجھ سے کیسے نین ھٹاؤں
مجھے نہ پاس سہائے اور میں پاس کو نہیں سہاؤں

بیت

کس کے لئے کماچ*، صدیوں سے ہے سانت میں
سارا دیس ڈیاچ†، منگتا ڈھونڈیں آدمی

آدھی رات اداس، گھاؤ گھاؤ انگلیاں
انسانوں کا ماس، کاٹ رہا ہے کینرا

اسی سوچ میں انگلیاں، اسی سوچ میں ساز
میں، میری آواز، دیتی ہے کس کو صدا؟

نکلی تیرے ساز سے، بھڑک بھڑک کر تان
آگ ہے تیرے گیان کی، تاروں کی پہچان
کیا کیا پتہ نشان، تجھ کو دیتا کینرا

---

* کماچ — کماچہ، سندھ کا ایک ساز

† ڈیاچ — جوناگڑھ کا راجا، جس نے بیجل کے نغمے کے عوض اپنا سر دے دیا تھا

‡ کینرا — ساز کا نام جو سندھ کا دیومالائی گائک بیجل بجاتا تھا اور نغمے کے عوض سننے والے کا سر مانگتا تھا

نوٹ ۔ ہندو دیومالا میں "کینر" اس دیوتا کا نام ہے جس کا چہرہ تو خوبصورت لڑکے کا ہے لیکن پاؤں پرندے کے ہیں اور بازوؤں پر پر نکلے ہوئے ہیں اور اسکے کاندھے پر ایک ساز ہے ۔ یہ پیکر گیت کے اڑان کی علامت ہے۔ یہ بت "اجنتا" کے غاروں میں ترشے ہوئے ہیں۔ "کینرا" — "کینر" لفظ سے ماخوذ ہے

چوکھٹ چوکھٹ چنگ، چھیڑا پونم رات میں
انساں کی بیچارگی، نکلی اوڑھے ننگ
سب پوچھیں یہ کون ہے؟ ایسا بانکا ڈھنگ
سوچ سوچ کا ڈنک، چبھتا جس کے گیت میں

گاتے گاتے راہ میں، جھومر ناچی زندگی
ایک ہاتھ میں کینرا، دوجے میں زلفیں تری
دنیا ساری ناچتی، دیکھو میرے گیت پر



گیت جسے سمجھا ہے تو، ہے مقتل کی چھاؤں
گاتا گاؤں گاؤں، سر مانگے ہے منگتا

گیت جسے سمجھا ہے تو، سو ہے کلہاڑی دھار
ٹکڑے کر کے پھینک دے، لہراتی تلوار
نربل، جی مت ہار، سُر میں تیرا آسرا

گیت جسے سمجھا ہے تو، آگ ہے وہ انمول
جس کی سوچ سماج کو، کردے ڈانوا ڈول
سلگیں کوِتا بول، جگمگ جگمگ زندگی

گیت جسے سمجھا ہے تو، بھڑکے تو بھونچال
ڈھا چھوڑے گا ڈھیر میں، سارا خام خیال
دھرتی پر پامال، گر کر کنگرے جھوٹ کے

گیت جسے سمجھا ہے تو، آج تلک اتہاس
کروٹ لے جس مین اٹھا، کوئی کالی داس
آئی جس کی اوٹ میں، ودیا پتی کی باس
بھٹائی کے بھٹ پر، جس کا نیہہ نواس
جس مین میرا ماس، کاٹ رہا ہے کینرا

گیت جسے سمجھا ہے تو، سپنوں کا سنسار
جن مین مہک بسنت کی، وہ پھولوں کے ہار
ڈھالے وہ سنسار، مات کرے جو موت کو



آ رے بھٹائی آ، خاک تری پلکوں پہ لوں
بھائی تیرے ساز کو، کب میں نے توڑا
وہ ہی ساز صدا، وہ ہی جڑاؤ جوگ پر

تجھ کو ساری سندھڑی، ترسے بھٹ دھنی*
کبھی نہ ہوگی ماروی، دوجی ماں جنی
داسی تری بنی، گیان کلا اس دیس کی

میرا جی اچاٹ، تیرے مدھ بن او میاں
تو وہ ہاٹ کلال کی جس تک میری باٹ
اندھیارا ہر گھاٹ، اجیارا ہے تجھ تلک

میں لے آیا لوٹ، جو کچھ تھا اس جام میں
باقی سب کچھ جھوٹ، مدھ کی سلگن کے بنا

پہلے آیا 'شاہ'، کاش مجھے سمجھے کبھی
سندھڑی تیری آہ، سلگی میرے راگ میں

بول، ہمارے بعد، کس کا ہوگا کینرا؟
کیا کرے گی یاد، رہ رہ تجھ کو سندھڑی



کون رنگے چوکھٹ، چنگ کہاں مانگے لہو
سندھڑی، او سورٹھ† بیجل سارے بجھ گئے

* بھٹ دھنی ـــ شاہ عبداللطیف بھٹائی رحہ کا لقب
† سورٹھ ـــ رائے ڈیاچ کی بیوی

میری جکڑی جان کو، سچ وہ کس بل دے
سر تلوار تلے، جو کہنا ھو سو کہوں

اک جھٹکے سے توڑکر، زنجیروں کا بار
پوری چوٹی تک چڑھا، دیکھی بھری بہار
کلا نبہ میں بلہار، جس کی شکتی راگ میں

اور نہیں کچھ پاس، آج مرے، اس کے سوا
ھاں یہ میری آس، جس کی اگنی راگ میں

روتی تھی کل رات، مسکی بھرتی سندھڑی
بس جیسا منہ میں لگے، بہنا منجھ کو بھات
دکھ کی کالی رات، کاٹیں آخر کس طرح

سر نیہوڑائے گھاٹ پر، مانجھی نیر بہائے
سوچ رہا ہے ھائے، کہاں گئیں سب کشتیاں
بھولے، کیسی ناؤ، کن کی تکتا باٹ تُو
دے کر دکھ کا گھاؤ، مانجھی سارے مرگئے

او ری سکھی کس گود میں چھپ کر نیر بہاؤں
دکھیا سارا دیس ہے، گم سم سارا گاؤں
روؤں دھیر نہ پاؤں، رتیاں بیتیں کس طرح

چھپا اوچھا بھیڑیا انساں کے اندر
بوجھ برہ کا بن گیا چھاتی پر پتھر
گائک تو گھر گھر، کاہے چھیڑے چنگ رے؟

چھت چھت سے چھن چھن گرے، انسانوں پر زہر
دیواروں میں سنسنائے، گرم ہوا کا قہر
یہ اندھیارا شہر، کیوں چمکائے جوت رے؟

سندھڑی؟ جھوٹے کانچ پر، منوا مت للچائے
موہے موتی پر نیئن، اب دھن پا کر پچھتائے
بنتی کر تو پائے، لیلاں* اپنے پیار کو

ڈھونڈا کر اب ہائے ری، پیا پنھل کے پاؤں
ڈھلی رات بسرے سجن، یاد نہ آس کا ناؤں
کہاں پیا کا گاؤں، کدھر چلی ہے باوری

پونچھوں آنسو میں ترے، میری اور تو آ
تیرے بالکوں پر بتا، قہر یہ کیا ٹوٹا
او دھرتی ماتا، شراپ نہ دوجا دے ہمیں

---

* لیلا چنیسر سندھی کی ایک لوک کہانی ہے۔ چنیسر کی بیوی لیلا نے اپنی داسی کونرو سے ایک موتیوں کا ہار لے کر اُسے چنیسر کے ساتھ شب باشی کی اجازت دی تھی

ڈالی کاٹی ڈال سے، سب نے سنی کراہ
دھرتی دھرتی آہ، جس کا دکھ میں بھوگتا

آنکھیں لہولہان ہیں، اپنی دھرتی پر
انسانوں کے سر، کاٹیں ہاتھ انسان کے

بنجارو، ساتھی مرے، آئیں گے ہر حال
جمگھٹ ہوگا گھاٹ پر، بدلیں گے احوال
جی کو سو جنجال، پی بسرائے نا بنے

مت جاؤ بیراگیو، یہاں بھی ہوگی بھور
کڑا کیا میں نے جگر، چلی پیا کی اور
رات پڑی گھنگھور، چاند اچانک چھپ گیا

سدا بسے او سندھڑی، تیرے کھیت بسیں
پھولے رنگ بسنت کا، من ہولی کھیلیں
بھاری زنجیریں، ٹوٹیں سب کے پاؤں کی

ہنس مکھ چھیل چھبیلیاں، چہلیں کرتی جائیں
پیا سے راہی دیکھ کر، پانی سدا پلائیں
جی کی پیاس بجھائیں، اک البیلی اوک سے

کامنیاں ، من موھنیاں ، دمکیں جن کے کھیت
میں سمجھا تھا بیت ، نکلیں پوری آیتیں

جھن جھن جھانجھر ، جھمکیاں ، ھنس مکھ مارو ، کھیت
سارے بر میں بیت ، چن چن جھولی میں بھروں

تیرے چرن چھوؤں ، او دھرتی ، او ماں مری
انساں انساں کے گلے ، لگ کر جھوم اٹھوں
اور نہ کچھ جانوں ، میں تو پیت پکار ھوں

پیتم کو پہنچا ، کاگا یہ نیناں مرے
جن کی پھبن سوا ، دیکھوں تو پاپی بنوں

مالا مت مرجھا ، آئے ، وہ آئے سجن
ھائے مرا منوا ، کس پر وارے کیتکی

سارے دھن کی ھے اگر ، دھرتی دھن والی
کسی کسی بگیا میں کیوں ، سدا ھے ھریالی
کوئی کوئی سنسار میں ، سکھ کا کیوں والی
سوچ کے کیا ڈھالی ، یہ دنیا بے ڈول سی

بچھم سارا آگ، چٹخ رہیں چنگاریاں
دھرتی تیری آہ سے، جگ مگ میری جاگ
لال لہو سا راگ، ماں، تجھ کو ارپن کیا

لال لہو سی رات، مسکی بھرتی مانت میں
ساری رین صلیب پر، رُکی نہیں برسات
دیکھ یہ میرے ہاتھ، کیلیں ٹھوک رہی کلا

جگ مگ سب جہان، کھیس نکالے کھوکھلی
اتنا تھا کھوٹا کبھی؟ جیسا اب انسان
نا جانوں نادان، کب سوئے گا چین سے

لایا آدھی رات، کنٹھا کنٹھا کیتکی
ہارا منوا ہائے رے، سانی اپنی مات
سن تو میری بات، پاؤں تو چھونے دے مجھے

غزلیں

خلیفہ گل کے بعد سے سانگی تک سندھی کلاسیکی غزل موضوع اور طرزِ ادا کے مختلف مدارج طے کرتی ہوئی ایک خاص منزل تک آئی لیکن اسکا لسانی مزاج فارسی آمیز رہا اور سندھی زبان کے اپنے استعارات، علامتیں اور محاورے اسمیں بہت کم جگہ پا سکے۔

شیخ ایاز کی شاعری اس اعتبار سے منفرد مرتبہ رکھتی ہے کہ اس نے اپنے کلام کو نہ صرف فارسی کے اثر سے آزاد کیا بلکہ اپنی غزل کو بھی اپنی لسانی مہک دی۔ موضوعات کے لحاظ سے بھی شیخ ایاز کی غزل کے افق سے اس کا عہد صاف دکھائی دیتا ہے۔ اسکا اسلوب کلاسیکی غزل سے مختلف ہے اور اس میں وہ غنائیت رچی بسی ہے جو اسکی غزل کو وائی اور بیت کی ہم رشتہ بنا دیتی ہے۔ ایاز نے سندھی غزل کو جدید فکر اور جدید حسیّت سے آشنا کیا اور اس طرح اپنی ذات سے ایک نئے عہد کا آغاز کیا۔



سکھی پیا سے ملے تو کہنا کہ چاندنی تجھ بنا نہ ہوگی
جو آئے، میرے اماس میں آ، کہ بن میں پھر رادھکا نہ ہوگی

کبھی بھی تجھ پر یہ دوار دل کے نہ بند ہونگے، کبھی چلی آ
یہ چار آنسو سدا رہیں گے، تیری سواگت بھلا نہ ہوگی

کہیں نہ دھندلائے دیپ تیرا للاٹ کی لٹ نہ ڈگمگائے
پرے سویرا، پتہ نہیں ہے، یہ رات کب تک بِدا نہ ہوگی

اداس کاتک کی ہیں ہوائیں، ملن کی مدرا ابھی نہ آئی
پکار تن کی ہڑک رہی ہے، کہ پیاس ایسی سدا نہ ہوگی

پرے سے آئے پکار کوئی، مگر ہے ندیا کا تار تیکھا
'ایاز' کیوں گھاٹ ڈھونڈتا ہے، ندی تو تجھ سے جدا نہ ہوگی



نین آرزوئیں ، نین التجائیں
نین تیرے صدیوں کی لائیں صدائیں

خدا خوش رکھے تو نہ سائل کو سمجھا
چلے دیس ہم ، تجھ کو دے کر دعائیں

ہماری طرف بھی میاں ہو یہ مینا
گھڑی بھر کو گھنگھور ہیں یہ گھٹائیں

ترا چنگ گائک امانت کسی کی
کہیں سر سوا دے نہ دوجی صدائیں

بھنبھور آج حسرت کی تصویر دیکھا
کوئی پوچھتا تھا پنہل کی دشائیں



میلے میں تو تنہا تنہا، کس کو ڈھونڈے رے؟
آنکھ میں آنسو ہاتھ میں گجرا، کس کو ڈھونڈے رے؟

سرسوتی کے مندر میں تو کس کی تکت ہے باٹ
کس لئے ٹھہری تیری وینا، کس کو ڈھونڈے رے؟

تیری آنکھیں پھر بھی پیاسی، تال تلاؤ سو
ہرنی جیسے میرے منوا، کس کو ڈھونڈے رے؟

سانجھی بیلا، کالا کنچھی آئے بسیرے لوٹ
پر پھیلائے پیار پکھروا، کس کو ڈھونڈے رے؟

ساری جیون مایا سپنا، سپنے اس میں ہزار
تو سپنا، سپنے کا سپنا، کس کو ڈھونڈے رے؟

پیر نہیں دھرتی پر تیرے، منزل تیری کون؟
ہر رستے سے نکلے رستا، کس کو ڈھونڈے رے؟

او رکھوالے، کیوں کریدتا جیون کی یہ راکھ
لے کر اگنی جیسی آشا، کس کو ڈھونڈے رے؟

یہ گرمی کا سورج جیسے کھلی ازل کی آنکھ
کیوں چھوڑی چھاؤں کی چھایا؟ کس کو ڈھونڈے رے؟

دریا آہیں بھرتا ہے، سن بھنور بھنور کا شور
او بھرے تو نیّا نیّا، کس کو ڈھونڈے رے؟

کالی رات، ستارے ڈھونڈے کوئی اڑتی کونج
پیارے تو بھی تارے تکتا، کس کو ڈھونڈے رے؟

ساری رات برستا رہتا ساون تیرے پاس
نیر بہائیں نین ہمیشہ، کس کو ڈھونڈے رے؟

کوئی نہیں اب آنے والا، مورکھ، تیرے دوار
اب تو کھول نہ یہ دروازہ، کس کو ڈھونڈے رے؟

ان ہونی کو چاہے، تیری بنے نہ ہونے سے
دیکھ، ہون ہونی کا لیکھا، کس کو ڈھونڈے رے؟

شاید تو ہی پاگل پورے پاگل خانے میں
ہر پاگل ہے تجھ پر ہنستا، کس کو ڈھونڈے رے؟

گر گیا ہار ہنڈولے میں، اور مر گئی سندر نار
موتی موتی تجھ کو پیارا، کس کو ڈھونڈے رے؟

دھول اڑی ہے کاک گری ہے پچھلے پہر 'ایاز'
کیسی مومل میرے رانا، کس کو ڈھونڈے رے؟



تو جی جو نہ ہارے کوھیارے*، یہ دن بھی گزارے جائیں گے
کیوں بیٹھا پیر پسارے، اٹھ، کٹ رستے مارے جائیں گے

کیوں تکتا گھاٹ کی اور، ارے، کوئی دوجی ناؤ نہ آئے گی
آنا ہے تو آ، او بنجارے تجھے پار اتارے جائیں گے

اس دریا میں جو دھشت ہے، اک دن محشر بن جائے گی
تو اور میں تو بس سندھو میں اک لہر ابھارے جائیں گے

کوئی جھل مل جھل مل جگنو کی، کوئی ٹم ٹم ٹم ٹم تاروں کی
گھنگھور گھٹا کا گھیرا ہے، پھر کون سہارے جائیں گے

مرنا ہے ہر اک انسان کو، پر یوں نہ مریں گے ہم ساتھی
کوئی آگ لگا، شعلے بھڑکا، اک نئے کنارے جائیں گے

---

* کوھیارا — کوہ پیما، پنوں



یہ کیسی موڑھی مت* لوگو دھرتی بھی توھے جنت لوگو

یہ مہنگی چنری ریشم کی لو پریت گنوائے پت لوگو

یہ کھلے کنول سے پاؤں تھے جو کاٹ گئے پربت لوگو

کوئی منزل ھے دو پہری کی کیوں ساری باٹ آتت لوگو

یوں کس نے پکارا سولی کو اک گیت پہ ھے یہ گت لوگو

کس مہندی رت کی ریت نے کی دھرتی خوں میں لت پت لوگو

یہ پیار کنی، تھوڑی بھی گھنی کی مانگ تانگ پورت لوگو

یہ سپنوں کا تانا بانا یہ آدھی رات بنت لوگو

کچھ 'شاہ' نے دی کچھ 'شیخ' نے دی
اس سندھڑی کو صورت لوگو

---

* موڑھی مت — مت ماری گئی



کوئی یوں بولا، کوئی ووں بولا، پر سب کے منہہ پر بات رہی
کوئی تو سریلی آگ تھی وہ، کوئی تو بھری برسات رہی

وہ آدھی رات کا سپنا تھا، جو سب کی جاگ جلاتا تھا
کیا رم جھم رم جھم روپ نے کی، کیا برکھا رت کی رات رہی

کیا کیا چنگاری چنگ میں تھی، وہ تان جو آگ امنگ میں تھی
جی جھوم گیا، جاں جھوم گئی، کس راگ کی چوکھی گھات رہی

پہچانا کوئی نہ گاتے کو، اس دھرتی کے مدھ ماتے کو
تھا کون؟ چلا کس اور گیا، اک بھید بھری یہ بات رہی

گر دل کے داؤ پرکھ سکتے، شاید یہ بات سمجھ سکتے
تم سمجھے جس کو جیت سدا، وہ جیون بھر کی مات رہی

گو ساز پرانا تجھ کو ملا، آواز نئی دے دی تو نے
کیا تو نے گیت 'ایاز' کہے؟ ہر گیت میں تیری ذات رہی



تجھ بن تو مجھے چنگ چڑا* چاند نہ بھاتا
منجدھار مری ، آ ری ، چلی آ ری ، چلی آ

ہر رات نئی ، ریت نئی ، گیت نیا لا
جب تک نہ پرانی ہو لگن ، وار نیا سا

میں جاگ بنوں راگ بنوں آگ بنوں گا
سچل بھی مرا میت ، بھٹائی سے بھی ناتا

تو سانپ بھی ہے ، آنچ بھی ہے ، جان جلے سندھ !
کچھ سوچ نہ ماں ، اور بھڑک ، اور بھڑک جا

کر جان بھی قربان مگر لوٹ نہ گائک
انساں پہ ایمان رکھے ، چنگ لئے آ

میں سندھ گیا ، ہند گیا ، سچ جو کہے آج
ہے شیخ 'ایاز' ایک ، نہیں کوئی بھی دوجا

---

* چڑا — گھنٹی - "سوھنی مہینوال" کہانی کی طرف اشارہ ہے



دھرتی کیا کیا دان کر گئی
دکھ دے کر انسان کر گئی

آئی تیری یاد تو پیتم
سولی کو آسان کر گئی

طوفانوں سے کھیلتی کشتی
ساحل کو حیران کر گئی

پیت کرشمہ دکھلاتی ہے
کفر پہ بھی ایمان کر گئی

ویرانی نے پیاس ابھاری
ساغر پر احسان کر گئی

پیڑا اور بڑھائے ناتے
دل دل کا درمان کر گئی

بھینی مہک بسنتی آئی
سانجھی کو سنسان کر گئی

ایسی مدھ 'ایاز' پلائے
گھونٹ گھونٹ پہچان کر گئی



بے موت مرے ہیں تیرے لئے انسان ہزاروں، میں ہی نہیں
اس دنیا میں، اے دیس! ہوئے نادان ہزاروں، میں ہی نہیں

گر نذر کسی نے جاں کردی، کرلی دھرتی نے پھر بھرتی
موہی ہے جن پر یہ دھرتی، مہمان ہزاروں، میں ہی نہیں

ساری شب آنکھ نہ جھپکی ہے، اور شبنم شبنم ٹپکی ہے
گر بھور پسارے اوک، تو اے زندان، ہزاروں میں ہی نہیں

ہیں یاد کسے وہ شان بھرے، جو آن کو سچا جان مرے
کیا بزدل پرکھے مان مرے ارمان ہزاروں، میں ہی نہیں

کیوں چاند ہمیشہ رات پڑے، دے پورنما میں زہر بھرے
ہے کتنا پچھلا پہر پرے، حیران ہــزاروں، میں ہی نہیں

تو کہہ تو نہ میں تڑپوں پھڑکوں، پر تجھ سے اتنا پوچھ تو لوں
خاموش کرے گا کس کس کو، اعلان ہزاروں، میں ہی نہیں

یہ دور 'ایاز' گزرنا ہے، اور اپنا بھاگ سنورنا ہے
اس آگ کو اور بپھرنا ہے، امکان ہزاروں، میں ہی نہیں



دھرتی چمکی، ریتی اڑتی، سورج ھوا بھبوکا
ھرنی یوں بھی مرنی، پر جو مارے بس سناٹا

جُگ جُگ کا جادو ھے تیری سانجھی بیلا لاڑ*
تال ترائی پر اڑتی جب کونجیں ڈالیں چھایا

پیر ھمارے ریشم جیسے، تیکھے کنکر ھائے
کیچ نہ ھم سے پیچ اڑائے ھے بھنبھور بھلا سا

ھونٹ چومنے کو ابھرے ھیں، اے چوتھی کے چاند
کیسا سندر سپنا ھے، جیون کا سپن نیارا

تیری چھاتی چھلنی چھلنی، تیرے نیناں نیر
آھیں آھیں تیری بانہیں، پھر کیوں پیار کیا تھا؟

جو کل تھا سو آج نہیں ھے، وقت نگل سب جائے
اس میں جو پل پیار بچائے، وہ ھی جی پائے گا

اڑنا جانے یا نہ پکھیرو، کچھ، تو ذرا پر مار
یہ پنجرا ھے جب تک سمجھے تو پنجرے کو پنجرا

* لاڑ — جنوبی سندھ

آؤ، اڑیں، ہے سامنے میداں، سامنے کھیت کھجور
آؤ، آتر، کرتا ہے اشارے، مینھہ ہے کل سے چھایا

آئی روپ انوکھا دھارے، گلی گلی بن بن
پردیسی سے پیت لگا کر اپنے دیس کو دیکھا

چاند! ہماری گلی نہ اتنا چمک ارے مورکھہ!
چونک اٹھے، کہیں جاگ پڑے، ہے سجن ابھی تو سویا



یہ بین نہ دیں گے چین، ذرا اٹھ، کس نے بلایا ہے پیارے
یہ شاید وہ ہی رمتا ہے، پھر پیاسا آیا ہے پیارے

جس وقت چراغِ شام جلے، اور میخانے میں جام جلے
اس وقت ہماری راہ پڑے، اپنا بھی پرایا ہے پیارے

جس وقت ہمارا ساز تپے، جب تار گھٹے آواز اٹھے
اس وقت اگر گردن بھی کٹے، جو آیا گایا ہے پیارے

انساں، انساں کی مٹی کو میں نے اشکوں سے گوندھا ہے
کیسا چکنایا ہے پیارے، کیا جام بنایا ہے پیارے

ہے چار طرف مہران* رواں، جس کا نہ اتہ جس کا نہ پتہ
یہ روح جزیرہ حیرت کا، جس بیچ سمایا ہے پیارے

کالے کیسوں میں رات بٹی، یا سرخ لبوں پر بھور پھٹی
یوں وقت کٹا، یوں عمر لٹی، سب سوانگ سجایا ہے پیارے

یہ گھاٹ اندھیارے دیکھ، ذرا، قہری ہتیارے دیکھ، ذرا
پھر دیکھ، کہ جل کے جھاگوں پر کیا دیپ جلایا ہے پیارے

ہیرے تو نہارو اے لوگو! کنکر مت مارو اے لوگو!
دیکھو تو ہنر پھر بات کرو، کیوں شور مچایا ہے پیارے

---

* مہران — دریائے سندھ



ساری رات چِتا پر لیٹی جل جل راکھ بنی
بھور سمے میں اوس بوند بن آخر یاد ڈھلی

بیٹھ کے اب کیا گھاؤ کرید یں جا جا واپس وید
تو تو کہے، پردل بھی مانے، بھرے گا زخم کوئی

زنداں کی کھڑکی کے آگے رک کر چاند جھکا
گڑتی پیر کڑی کے نیچے پیڑ مری چومی

دم روکے دریا نے دیکھا، دھارا ٹھٹک گیا
آئی پیتم، پیتم، کہتی کوئی جیا جلی

آری، کلا کی کالی تجھ کو دے دوں اپنی بھینٹ
دھو دے پاپ جگوں کے، میرے لوھو* کی پچکاری

دھرتی تجھ کو یاد کرے اور تجھ کو دھرتی یاد
چاہت تیری نہیں پرائی، ہو بھی نہیں سکتی

---

* لوھو — لہو



شہر شہر نے پتھر مارے جن سے ہو گیا چکنا چور
پھر بھی اس نے نعرہ مارا مرد کوئی نکلا منصور

بستی بستی نگری نگری گیت ہمارے گونج رہے
پورنما میں چنگ بجا تھا، رات سجن تھے کتنی دور

کل جو وفا کے ویرانے میں پیاسی مری کوئی ہرنی
لگا تھا سورج، آنکھ، ازل کی ، بھرا تھا اس میں اتنا نور

دریا دریا اس کا دل تھا، صحرا صحرا اس کے نین
پل کا کوئی مسافر تھا وہ، جانا ٹھہرا جس کو دور

اس تپتے دن میں آئے ہو، پہلے آئے کیوں نہ 'ایاز'
چھپّر چھپّر تھی جب چھاؤں، نیم میں جب آیا تھا بور



ساگ اپنا پلی*، پھر بھی سندھڑی بھلی
بھاگ والی سدا، پیت جس میں پلی

تو کہے سندھڑی، میں کہوں جندڑی†
اک پہیلی تھی یہ، میں نے جو بوجھ لی

پیت لیلا بھی ہے، پیت کوُنرو بھی ہے
پیت پر کھے تو مجھ سی کوئی دل جلی

پاؤں دھیرے دھرو، آ رہی آ رہی
وہ رسیلی ہوا، وہ گلابی گلی

سندھ مرتا نہیں، ہے 'ایاز' آج بھی
پیاس کو آسرا، کوئی جل کی کھلی‡

---

* پلی — سندھ کا ایک ساگ
† جندڑی — زندگی
‡ کھلی — چمڑے کا تھیلا جس میں پانی بھرتے ہیں



جو ازل سے نہ ہو اور نہ امکان میں
اب تو ہے بات ایسی کچھ انسان میں

میں نے زنجیر پہنی پر آزاد ہوں
تو تو ظالم سدا سے ہے زندان میں

رات ناگن بھی ہے رات جوگن بھی ہے
اس کی رکھنا جڑائیں سدا دھیان میں

میں نے جانا نہ تھا، چاند گائک بھی ہے
چاندنی راگ ہے، رات سنسان میں

بادلو، بادلو، کچھ تو برسو ذرا
کچھ تو ٹھہرو ذرا، اس بیابان میں

پیت تو نے لگائی ہے انسان سے
اور وہ کہتے ہیں تو کب ہے ایمان میں



نظم کہاں ، جو روح نہیں گرماتی ہے
وہ اپنی منزل کو بھلا کب پاتی ہے

اس کی گونج کا کیا کیجئے محبوب کا جو
گونج ہمیں پیغام نہیں پہنچاتی ہے

گیت مرے ہیں آہیں تپتی دھرتی کی
گُن والی کب یوں ہی گیت سناتی ہے

ہاتھ چلا ، او ڈوبنے والے ، ارے فقط
پیت کسی کو پار نہیں پہنچاتی ہے

چیخ رہے راکاس*، مگر کیا ڈر ہے 'ایاز'
تیری دھرتی ابھی کہاں گھبراتی ہے

---

* راکاس — راکھشس



آکاش نیلا، نرمل اجالا
بھر بھر کٹورا، پورا پیالا

کہتی ہے کوئل، یہ کوک کیسی
ہے گیت میرا، سب سے نرالا

مہینوال دیکھے، جلتے ہیں تارے
سہنی مُکھائے، بالوں کا جھالا

اوتار کب ہوں، لیکن مری بھی
بجتی ہے بنسی گھر گھر، گوالا

سندھو سنہری، میں نے تجھے دی
آنسو بہاتے، کیا دیپ مالا

ہے آجکل تو، ہر گیت میرا
اندھیر نگری میں اک جوالا



میں بالک نٹھی اری ماتا
چندا دیکھوں آئینے میں

یہ کیسی زخمی بیلا ہے
جو گھاؤ لگائے سینے میں

وہ برکھا برکھا آئے گا
لیکن کس ماس مہینے میں؟

ساحل ساحل اک سپنا تھا
میں ساری رات سفینے میں

یہ دیس جلا ہے نفرت سے
یہ دیس کڑھا ہے کینے میں

اب امرت رس کو ڈھونڈ رہا
میں اپنے خون پسینے میں



ٹھنڈے کی ھوا میں گلابی بدن
ڈھکے کیسے اجرک مہکتا چمن

میانی* میں مچھلی کی سوندھی مہک
مسافر یہیں ھے ھمارا وطن

نہ دیکھا ھے 'خسرو' نہ 'غالب' کبھی
غزل در غزل پھر بھی اپنا چمن

کہا دن کسی نے تو ھم کو ملی
یہی اپنی دھرتی یہی اپنا دھن

مسافر ذرا نیم کی چھاؤں میں
کبھی بیٹھ بن کر مرا ھم وطن

تو جانے کہ اس دیس میں بھید کیا؟
تو سمجھے کہ کس پر ھوا من مگن؟

یہاں دھان میں سنگ سونا بنے
یہاں تپتی دھرتی رو پہلی بدن

* میانی ــ دریا سے مچھلی پکڑ کر رکھنے کی جگہ

پروتی ہے مالا آتر کی ھوا
یہاں ریت کی ھرکنی ہے رتن

برستا ہے مینہہ جب یہاں ریت پر
بکھرتے ھیں موتی جھن جھن جھن

کبھی سندھ کی سرمئی رات میں
اڑاتا ہے نندیا ھماری گگن

کبھی چیت کے چاند کو دیکھ کر
ھمیں یاد آتا ہے اپنا سجن

یہاں گیت نے موت کو مات دی
طنبورہ تھا وہ یا 'بھٹائی' کا تن

بھرے سانس ٹھنڈی یہ بھیگی ھوا
یہ بدلی ہے یا ماروی کا کفن

چنیسر* بھی دودو† بھی میرا 'ایاز'
کہوں کس طرح ان کے کیا تھے چلن

* چنیسر — سندھ کا ایک غدار جو دودو کا بھائی تھا ۔ (اس کردار کا "لیلا چنیسر" سے کوئی تعلق نہیں)
† دودو — سندھ کا ایک عظیم محب وطن



سچ پنچھی یا پنچھی کا
بہتے پانی پر سایا

اب آیا ہے دن ڈھلتے
مے پی کر گرتا پڑتا

کالے پنچھی جیسی رات
پیت ہماری ہے پنجرا

پیڑ پیڑ پر ماندے کاگ
پات پات میں سناٹا

سانت سمے پت جھڑ کی ہوا
بھرا نہ تونے کیوں پیالا

تن کی طلب سوا بھی میت
کوئی انساں، انساں کا

کون تپن کے تاؤ سہے
آ، کٹیا میں ہے چھایا

او مد ماتے میت کوئی
امرت رس برساتا آ

تجھ تک پہنچا کیوں نہ الاؤ
پھٹ نکلی جیون جوالا

چاند کہاں ملتا ہے چکور
جھپٹ کے لے آ انگارا

بجھ جائے گا آخرکار
ٹم ٹم کرتا کوئی دیا

کب تک اس کی جوت جلے
جس کی بیرن بنی ہوا

اونچے محل گریں گے کب
او جنتا میری جنتا

بولی گولی نہیں 'ایاز'
گونج تلک ہے بس اس کا



او مد ماتے ہولے چل
منزل منزل ہر اک پل

میرے مکھ پر تیرے ہاتھ
کھلتے جیسے نیل کمل

تیاگ گیا بیراگ گیا
ہے ہے چھوری تیرا چھل

مومل جس جیون میں نہیں
اس کا کیسا کاک محل

کسی کی نہیں سرائے یہ
رات گذاری لے اب چل

اس پر مدھ کا مینہہ برسا
کھلے کلی جیسا پل پل

اڑ کر کوئی تان بھروں
کب تک روکے گا ان جل

تالی مار نہ گھر آئے
تیری منڈیری پر طوطل *

---

* طوطل — سندھی میں طوطے کو پیار سے کہتے ہیں

اس جیون کو آگ لگا
جس میں نہیں کرم کا پھل

کوئی کوئی ایسے مور
تھر میں پا نہ سکے ان جل

برس رہے ہیں گھیرا ڈال
تپتی دھرتی پر بادل

بالو پر بوندا باندی
یہ ساون کا سر منڈل

کوئل میری نیند اڑائے
کوک کوئی ، تجھ سی گھائل

لاج رکھے سندھڑی کی 'ایاز'
جس کا گیرو بھیس غزل



کوئی آنتی کا امکان
گونج صدا، دونوں حیران

تڑپ رہی اب تک تہذیب
کتنا وحشی ہے انسان

ویسے ہی پاپی کے جال
ویسے ہی زر کے زندان

وہی ستم بلوانوں کا
نربل ویسا ہی حیران

وہی ہے سولی پر منصور
وہی ہے سرمد پر بہتان

وہی رہی گائک کی چتا
وہی ہے شاعر کا شمشان

آج بھی سوچ مصوّر کی
خون میں ڈبو کر کھائے نان

اب بھی نہ سوچے اندھا بیر
کس کی گلی ہوئی ویران

کس ماں کی ممتا ماری
کس بالک کے نکلے پران

بس نہیں ناگا سا کی پر
ناس کرے گا جگ نادان

لگا نہ میخانے میں پتہ
باہر رات اٹھا طوفان

پھینکا میں نے جام 'ایاز'
ویسا نہیں رہا انسان



اگر تجھے آنا ہو آ
کب تک کروں ترا سودا

اندر میخیں کوٹ کڑے
باہر گونجیں، مہک، ہوا

یہ گرمی کی اجلی بھور
آ، میرے آنگن آ

او، زنداں کی کالی ٹھنڈ
میں ہوں تجھ میں اک شعلا

جا جا، واپس جا او، وید
گھائل جانے گھاؤ مرا

مجھ کو کوئی مت دے مت
پیت نہ جانے پچھتاوا

او میرے محبوب وطن
وہی ہے تجھ سے نیہہ لگا

یہ میرا مظلوم قلم
مصلحتوں سے دور رہا

خون میں لت پت موت مری
مجھ سے خبر ہے پرماتا

میرے من میں ہے منصور
دار ہے جس کے جی میں جڑا



سُر کے بدلے سونا دوں
تو نہ کرے پھر بھی سودا

او گیتوں کے بنجارے
من موتی کی قیمت کیا

گھائل من کے گھائل گیت
جن میں گونج رہی پیڑا

جن میں دھرتی دکھ،
گھاؤ گھاؤ انساں کا



ریت سے اس دھرتی نے گھڑا
یہ سورج جیسا سپنا

کیوں آکاش سے آس لگائے
دھرتی سورگ نہیں ہے کیا!

کس سندرتا کا بہروپ
روپ بھری یہ پورن ما

پہنچے پہنچے پیاسے لب
جیون جھرنے میں پہنچا!

چاؤ بھرے مدماتے نین
جیسے رس لوبھی بھنورا

آنگن میں آیا ہے کون
کس نے تیرا بھیس بھرا

وہی ہے چوٹی، وہی لٹیں
وہی ہے مکھڑے کی مایا

بھرتی ہے کیا کیا بہروپ
میری مدھ ماتی کویتا



چاروں اور سمایا درد
پورب پچھم ہے بیڑا

او دھرتی ، او گربھ، وتی
دیکھیں آخر جنے گی کیا؟

شاید کوئی نیا انسان
شاید کوئی نیا وعدہ



رات یہ کہتا تھا سقراط
جھجک رہا کیوں جی تیرا

جگ کو امرت بانٹ کے آپ
وش کا پیالا پی بابا

کسی کی ہار بھی ہوتی جیت
موت میں بھی جیون ہے چھپا



ناری ، مالا بیلا کی
من مندر کی چوکھٹ، شام

ساون کی مدماتی رات
جلیں افق میں کتنے جام

چنگ، چڑا ، پورنما، چیت
سہنی ، دریا، موت کے دام

جھپٹ کے آ برھا کے باگھ،
من کے بن میں چھائی شام

باھر رنگا رنگ شفق
پنجرے میں پنچھی کی شام

باھر سورج جیسی ریت
بالو پر اپنا بسرام

وھی کوی اپنا 'سامی' *
سنے تھے جس کے گیت تمام

---

* سامی — سندھ کے مشہور ویدانتی شاعر

جس کی وائی مینھ کی بوند
جس کا سر ساون کی شام

شو کا ساتھا ناگ نڈر
کیسے تجھ میں آئے کلام!

جنم جنم کی جیت 'ایاز'
'شاہ'، 'سچل'، 'سامی' کچھ نام



کس قہری کالے کا ڈنک
چترا کے لے آیا یہ چنگ

پی آیا سورج کا سروپ
اک بیراگی بانکے ڈھنگ

من کے گھور اندھیرے گھاٹ
ساتھی تیرا میرا سنگ

آج پڑی جو بوند کوئی
ہوگیا جیون سر سارنگ

کاھے کاگا کرے پکار
نار نہ ڈوبی پیت کے سنگ

اس کی چنری لاکھ رچی
مرتی نار، شفق کا رنگ

سانجھی، مانجھی، جل پنچھی
آگ پہ برتن کا آھنگ

بیچ بہاؤ بن نہ سہائے
جل باسی کا کس سے سنگ

اب یہ جانے کون 'ایاز'
کیسی کوک پکارا چنگ



وہ پیڑا رین بسیروں کی
بن گئی گواہ سویروں کی

گر باگ سنبھالے ڈاچی کی
کیا چنتا کیچ کے پھیروں کی

ہنس کر اپنی جھولی دیکھی
رت آئی رسیلے بیروں کی

ہے رات ڈھلی، وہ آئے گا
تو چھوڑ نہ پائل پیروں کی

میہار ملن کی بیلا ہے
کر بات گھڑوں اور گھیروں کی

کیا ساری سندھڑی ناچ رہی
یہ چھم چھم تیرے پیروں کی

نظمیں

دھوپ چھاؤں



سانجھی بیلا، جیا اکیلا، دھرتی لائی دھیر
دل نے توڑی گھڑی گھڑی کی کڑی کڑی زنجیر

ڈھورے* پر اڑتا نیرگ† پھیلائے نیلے پر
میرے من کا کھول جھروکا، آئی پون آتر

سانجھ، سمے کی پرویّا میں دھیمے دھیمے بین
تھوڑی دیر نہ گذری نکلے گگن میں کتنے نین

دور افق تک پہنچی میری پوری نین نہار
جھمکے مجھ میں جنم جنم کے بسرے ہوئے وچار

کون ہے تو؟ کیوں آیا ہے؟ کیا تیرے ساتھ ہوا ہے؟
کہاں ہے تیرا دیس؟ ابھی تک بیٹھا پر پھیلائے

کیسے آخر لگ گئی تیری اس پنجرے سے پریت؟
جو تجھ کو پورا کرنا ہے اپنا یہ سنگیت

دیکھ وہ بھکشو سنکھ بجاتا پوجا کارن آیا
پاس ترے کیا؟ گیت ادھورے، تو کیا دان کرے گا

---

* ڈھورا — بارش کے پانی سے بنی ہوئی جھیل
† نیرگ — سندھ کی ایک مرغابی

تیرے دکھ کی دین نہ کوئی سکھ کے سوانگ ہزار
بول! کسے تو کہتا اپنے تن کا روپ نکھار

مرنا ہے اور نہیں ہے پھرنا، پھر بھی سمجھ نہ پائے
پھر بھی اس ریتی سے کھلونے، پل پل نئے بنائے

تجھ کو جُگ جُگ جوت ملی ہے نت نت دیپ جلا
سارا تن من واری کر کے اپنا نیہہ نبھا

کبھی کبھی کوئی دھونکنی، ان میں سانس سما
پگھلا کر ساری زنجیریں، ہلکا ہو کر گا

پل پل ہے پکھراج، سجن تو گھڑی گھڑی کو گھڑ
بول بول ہے سونا اس میں اپنے جی کو جڑ

جاتا سمے نہ مانے، پھر نہیں آتا یہ بنجارہ
جب تک سانس ہے، گا لے، مر کر لوٹا کون دوبارہ



ساجن رے، ہم نیند کے نیناں
سوتا جیون جاگ اٹھا
جائیں کتنی دور، الا
تارے تارے پیچھے چھوڑے، آگے گیا شور الا
سو سو چندا اپنے ساتھی
کاھکشاں کے کئی قافلے راہ گذر میں
اپنے سفر میں
کائنات آئے اک جائے
جن کا اور نہ چھور ملے
زماں مکاں سے ملی نجاتیں
ازل سے لیکر ابد تلک ہیں سکھ کی براتیں
پلٹ جو آئیں
کیا کیا لائیں
راز انوکھے
ساز لئے انداز انوکھے
چندا ہم سے نیہہ لگائے
تارے دکھ میں نیر بہائیں
ہم یہ پیت خزانہ لیکر
جگ چمکائیں
جوت جلائیں
ساجن رے، ہم بھاگ جاگ کے
سوتا جیون جاگ اٹھا



سا گر کیا کیا بپھر اٹھے
میٹھی میٹھی بہت اچھوتے
جھکی گھٹا جب گرج کرے
کیا کیا جھڑیاں گیت لگائے
جس پل میرا جی بھر آئے
پھر ہر کھٹکا بھاٹا بھاٹا
پھر اتھلے میں ہم کیا تیریں
سا گر کیا کیا بپھر اٹھے



موت — کالا اداس حبشی ہے

دیکھ کر مینہہ، ہوائیں، سناٹا
آج زنجیر توڑ کر نکلا
اور دیوار زندگی سے پرے
اِک کھلے ریگزار میں پہنچا
دور تک رات کی اندھیری ریت
نہ ستارہ، نہ کوئی انگارا
آپ اپنے ہی زور میں بہتا
جانے کس اور آج چل نکلا

موت کی گھات کس نے سمجھی ہے
موت — کالا اداس حبشی ہے



ترمرے ★
ترمرے
ہر گھڑی
ترمرے
جب کوئی
آرسی
بھی نہیں
دھوپ کی
روشنی
بھی نہیں
پھر بھی یہ
ترمرے
زندگی
ترمرے

★ ترمرے — آئینے سے منعکس ہونے والا سورج کا عکس



جل کی سلگن کوئی نہ جانے
آنسو پونچھوں چھپی چھپی

چوکھٹ پر تو پورنما ہے
ہاں پر من کٹیا میں کیا ہے
کسی نے کب اس میں جھانکا ہے
پھیکی پھیکی رہی ہنسی

وہی ہے انبر وہی ہے دھرتی
اور وہی ہے خوشبو اس کی
وہ مدماتا، جو نہیں آیا
جس کی من میں ہوک اٹھی

پریت بھی مایا، روپ بھی مایا
ان کی یادیں ڈھلتا سایہ
جن میں نہیں اک جیون باتی
جن کی جوتی جِھکی جھکی *

---

* جِھکی — مدھم



اوس لگی جو موتی موتی

قطرہ قطرہ چن چن کے
لایا سورج کے آگے

آنسو تھے جیون کی جوتی

جن کو پرو پرو میں نے
کسی پہ واریں مالائیں

اڑ گیا پانی، چمکے سورج
انساں فانی، چمکے سورج



من کے اوپر کوئی بجلی بھڑک بھڑک کڑکے
بھولی ڈال، بسیرا بکھرا، پنچھی حیرت سے
دیکھ رہا آکاش
کہے، "اے کاش
میں اڑ جاؤں اس دھرتی سے..........!"



میں سپنا ہوں میں سپنا
تیرا سپنا، تیرا سپنا
تو جو مجھ میں چھپا ہوا ہے

تو جو مجھ میں بیٹھا گائے
گیت مرے منہ سے کہلائے
اس پنجرے میں پر پھیلا کر
اڑ جائیگا پنجرا ڈھا کر
ڈھونڈے گا پھر دوجا پنجرا
نئے سروں کی سنپورنتا *
مجھکو بھی سپنا سمجھے گا
کسی نئے پنجرے میں بسے گا
جب تک پھر سے اُڑ نہیں جائے
تو جو مجھ میں چھپا ہوا ہے

میں سپنا ہوں میں سپنا
تیرا سپنا، تیرا سپنا
تو جو مجھ میں چھپا ہوا ہے

---

* سنپورنتا — تکمیل



رات کویتا کے کنٹھے پر
سرسوتی اور کالی نے
پورنما میں امرت رس کا گھونٹ بھرا ہے
جگ جگ سے جو بھئیں بیرنیں
ایک ہی تٹ پر ان کا ساتھ
کتنی مدت بعد ہوا ہے
کوئی مہا کوی جنما ہے



تو جو آیا سورج سا
او سجنا
رات ڈھلی پھر بھی نہ گیا
او سجنا

پوچھا تھا ھر پنہارن سے ، سمجھ نہ پائی پھیر
لوٹ آئی تھی گھوم گھوم کر گھڑے گھڑے کا گھیر
جنے جنے کی جان دیکھ لی ، ملے سبھی انجان
ھنسی آڑاتے چلے گئے سب ، رھی برھن حیران
سب نے کہا تھا ، تجھے ہوا کیا ! ھائے ری مورکھ ھائے
کس سے پریت لگائی تو نے پتہ نہ جس کا پائے
کسی کا ایسا روپ نہیں نا ایسا کوئی سُبھاؤ
بنجارے کا تری سکھی ری ، بھید ملے نہ بھاؤ
کہا تھا میں نے پکار دیکھوں گلی گلی کے پاس
ابھی تو ڈولے پیڑ پہ کاگا ابھی ھے ان کی آس
لوٹ رھی تھی الٹے پاؤں ، گھوم گلی اور گھاٹ
دیکھا ، کٹیا اوٹ کھڑا ھے روکے برھن کی باٹ

تو ھی میری اور آیا
او سجنا
تو جب آیا سورج سا
او سجنا
رات ڈھلی پھر بھی نہ گیا
او سجنا



جس وقت ہوا کے جھونکوں میں
کوئی گیت سنو
سمجھو میں سنگ تمہارے ہوں

میں دور سہی، پر آتا ہوں
کوئی ریکھا دور دھندلکوں میں

جس دم دیکھو
سمجھو میں سنگ تمہارے ہوں

یادوں کے سہارے تم تیرو
ہاں، آئندہ کے دھڑکوں میں

جس دم ڈوبو

سمجھو میں سنگ تمہارے ہوں
سمجھو میں سنگ تمہارے ہوں

سوامی رام تیرتھ کی خودکشی

تو بھی پانی، میں بھی پانی آ کریں اٹھکھیلیاں
دھار کا ہے تار تیکھا
ناؤ میری ہے پرانی آ کریں اٹھکھیلیاں
رات کو جب رات ڈھونڈے
کیا ستارا دے نشانی آ کریں اٹھکھیلیاں
سچ ترے سپنے کو جانا
جاگ اپنی جھوٹ جانی آ کریں اٹھکھیلیاں
ابھر کر کے بھر پورا
بیچ دھارے میں سمانی آ کریں اٹھکھیلیاں
جیت ہے تیری بھی پھیکی
ہار ہے میں نے بھی مانی آ کریں اٹھکھیلیاں
آ کہ تو بھی اک فسانہ
آ کہ میں بھی اک کہانی آ کریں اٹھکھیلیاں

ناچ دھن

پیت سجن کی پائل پائل
آیل ! آیل*
گھایل گھایل
میرے پیر

جیون کوئی جھونٹا ہے
اور مرا من
ریتی پر اک بوٹا ہے
جیون سر پر سانجھی ہے
اور مرا من
دو پہری کا مانجھی ہے
جیون جیسے کونج پرے کی
اور مرا من
پاس ترے اک کونج پرے کی
جیون لہر نرالی ہے
اور مرا من
ان پر پوجا تھالی ہے
جیون میں ہے آنکھ اجل کی
اور مرا من

* آیل — اے ماں

اس میں ہے اک ریکھ کجل کی
پیڑھ اٹھاؤں
دکھ بسراؤں
ہر دن بھ بجوں مدھ کے پیالے
دیکھ میں لائی ناچ نرالے
گھوموں، پلٹے کھاؤں
دھرتی اور آکاش نچاؤں
ڈھونڈوں گاؤں
ڈھونڈوں گاؤں
گیتوں کے گجرے پہناؤں
کیا کیا پوجوں، کیا کیا پاؤں
گھر گھر گونجے، در در چھمکے
پیاس بھرا دل
پھر بھی مشکل
یہ اندھیر
پیت سجن کی پائل پائل
آیل ! آیل !
گھائل گھائل
میرے پیر



میں ہرن تھا اور تو ہرنی مری
میں بھٹکتا تھا کسی کی آس میں
تلملاتا آرزو کی پیاس میں

تیری صورت ریت میں رُلتی ملی
تھا ترے نینوں میں اک آبِ حیات
میری پیاسی روح کی پہلی نجات

تیرے نینوں میں ابد تک آس تھی
میرے نینوں میں ازل کی پیاس تھی
تیرے نینوں میں کنول مسکا دیا
میرے نینوں میں کھلا دل اوس کا

نین تیرے مست تھے مدھ کی سمان
میرے نینوں میں بسے پیالے کے پران
میرے نینوں کی ترے نینوں سے پریت
میں نے لکھے تھے امر چاہت کے گیت

پر وہ ہرنی سے نین رم کر گئے
ریت پر جتنے تھے سب منظر گئے
نین میرے ان کے پیچھے رُل گئے
سانجھ کی پرچھائیوں میں گھل گئے



چن چن کانٹے کئے اکٹھے
میں نے اپنی جھولی میں
شاید ہر ڈالی سے پیارے
تو چن پائے کھلتے پھول
چبھے نہ کوئی کانٹا تجھکو
ترے لئے او پھول مرے
چن چن کانٹے کئے اکٹھے

جیون بازی میں نے ہاری
سوچ سمجھکر جانے بوجھے
شاید جیت سکے تو بازی
ہر داؤ پر کھلیں گے تیرے
رخساروں کے کومل پھول
تیرے لئے او پھول مرے
میں نے ہاری جیون بازی



دیکھ، کنول کھل اٹھا

جھوم رہی تھی پون، نیر کا چھلکا لگن
گائے بھنور* ہو مگن، گھوم گیا سارا بن
بھول گیا راستہ

کی نہ کنول نے نگاہ، کچھ نہ بڑھی رسم و راہ
دیکھ کے بھنورے کی چاہ، یوں تو کہا واہ واہ
پر نہ رکھا واسطہ

گائے پون بھی سدا، پھول بھی اس کا بندا
نیر اسے دے راستہ، روک لے رستہ سدا
جگ میں جو دیکھا تو کیا

دیکھ کے ٹھٹھکا 'ایاز'، سارا جہاں بے نیاز
ہائے کنول کا مزاج، کچھ تو قبولا خراج
کچھ تو کیا دل بڑا
دیکھ، کنول کھل اٹھا

---

* بھنور — بھنورے کے لئے سندھی میں مستعمل ہے



میں نے دیکھا
آدمی کی آتما میں
جھانک کر
تھا کوئی گہرا کنواں
دور سے مجھ کو نظر آئیں حسیں پرچھائیاں
جھلملائے چاند تارے کارواں در کارواں
میں نے سوچا
اور دیکھوں
اس کی تہہ میں جھانک کر
کھینچ کر دیکھا جو پانی ڈول بھر
دو جہانوں کی بلائیں تب مجھے آئیں نظر



جل کی جلتی جوت

میرے من میں لوٹ

تیرے در پر ارے کلال

دی ہیں صدائیں کتنے سال

بوند نہ تو نے دی

کاہے پڑی نہ ہوت؟

جل کی جلتی جوت

میرے من میں لوٹ



سانجھی سانت رکی پُروِیّا
کونج افق میں کرے صدا

گونج بنا تو آ

لیکن، گر تو گونج نہیں ہے
پھر تو کیا ہے، آخر کیا ہے

کچھ بھی نہیں ہے کیا ؟



میں گرجا تو گونج
میں مندر تو ناد *
کیوں تو میری نیند
روز اڑائے رے
کاھے جگائے رے
میرے آد جگاد †
میرے آد جگاد
میں مندر تو ناد

* ناد — سنکھ
† آد جگاد — ازل ابد



سانجھ سمے میں کالا کنچھی*
میرا من
جیون بن
اڑتے اڑتے تھک جائے گا
ننھا تن
میرا من
سانجھ سمے میں کالا کنچھی

---

* کنچھی ـــ سندھ کا ایک کالے رنگ کا پرندا



سلسلۂ کوہ میں چشمۂ آبِ رواں
پیڑ کھڑا سیب کا
سیب گرا ناگہاں
دھار پہ بہتا ہوا
دور سے آیا یہاں
دور کہیں جا رہا
کس کو خبر ہے کہاں

یہ شفق آلود شام، سلسلۂ کوہسار
خامشیٔ برگ و بار
دور کوئی جاندار
سلسلۂ کوہ میں
چیخ کے کرتا پکار
آئی صدا آر پار



رم جھم کیسی جوالا سے تو پیت لگائے ری
تیرا میرا کیسا ناتا؟ پیت گنوائے ری

تیرے پیر چنبیلی جیسے، کانٹے میری باٹ
سچ تیرا اور سپنا میرا، مجھ سے پیت نہ بانٹ

میں بیراگی نگری نگری میرا سفر چلے
کون وہ مندر جس کا میرے ماتھے تلک ٹکے

تیری باتیں چندن چورا میری باتیں آگ
میری خوشبو، دیکھ، کہیں جل جائے نہ تیرا بھاگ

تیرے سپنے ایسے جیسے نئی دلہن کے ہاتھ
میرے سپنے ہر کھیتر* میں ارجن رتھ کے ساتھ

میں ہوں اجنتا، میں ہوں الورا، پتھر کی آواز
میری روح گپھا سے گہری، کوئی نہ پایا راز

تو نے کب دیکھا ہے میرے سپنے کا سوراج
جس کے آگے کچھ بھی نہیں ہے یہ جمنا یہ تاج

* کھیتر — میدانِ جنگ

تو نے کب دیکھا ہے مجھ میں آدھی رات اروڑ*
جس پر کرے نچھاور چندا جگ مگ کرن کروڑ

میں سندھو کی دھار، نہ جس کو روکے کوئی گھاٹ
لہر لہر تلوار چمکتی بھنور بھنور کو کاٹ

جل تھل دھرتی، تھر تھر کھیتی، میں ساون کا مینہہ
تو ہے گھر کی شانت، لگایا کیسے مجھ سے نیہہ؟

ہاں، پر میرے پت جھڑ میں تو چھاؤں بن کر آئے
ہاں! پر میری چھت پر پورنماشی بن کر چھائے

تو میرا نروان نہیں ہے پر مری پورنما
تیرے روپ دھنی نے مجھ کو کیا کیا دان دیا!

جب بھی جیون کے رن میں پڑتا ہے کڑا گھمسان
تیری انکھیاں مجھ پر امرت برسائیں اس آن

جب بھی دھرتی کی الجھن سے بیٹھا پسارے پاؤں
ٹھنڈی چھایا بن کر چھایا تیرا سیٹھا ناؤں

---

* اروڑ ــــ قدیم سندھ کا صدر مقام

جب بھی مجھ کو قابو کرتے زنداں اور زنجیر
آئی تیری یاد بندھاتی دکھتے دل کی دھیر

جب چھوٹیں گے میت کرے گی سولی ہمیں پکار
ہنس کر میرے سنگ چلے گا سجنی تیرا پیار

تو میرا نروان نہیں پر تب تک رہے ملاپ
جب تک جگ میں ڈھونڈ نہ پایا اپنا کھویا آپ



آیا، آیا، آیا رے
سن لی تری صدا او سائیں

اپنے پیارے چھوڑ گئے ہیں
چاند ستارے چھوڑ گئے ہیں
اب اندھیارا چھایا رے
سن لی تری صدا او سائیں
آیا، آیا، آیا رے

سکھ کے سپنے روز سجاؤں
من ہی من میں دیپ جلاؤں
ہوا نے آن بجھایا رے
سن لی تری صدا او سائیں
آیا، آیا، آیا رے

وہ ہنس مکھ، سب اپنے ساتھی
تانے اپنی گھائل چھاتی
سب نے پران گنوایا رے
سن لی تری صدا او سائیں
آیا، آیا، آیا رے

راحت ہے یہ رن کی ریتی
ڈول میں آنسو، پیاسی کھیتی
پہلے کیوں بھٹکایا رے
سن لی تری صدا او سائیں
آیا، آیا، آیا رے

جھولی گیلی خالی خالی
آنکھ میں آنسو، سانس سوالی
آخر تجھ کو پایا رے
سن لی تری صدا او سائیں
آیا، آیا، آیا رے

چھیج*

ارے چاند، ارے چاند، سجن تو نے نہ دیکھا
وهی روپ، وهی ڈهنگ، سجن تیرے هی جیسا

اری رات، اری رات، سجن تـو نے نہ دیکھا
وهی بال، وهی انگ، سجن تیرے هی جیسا

ارے پھول، ارے پھول، سجن تو نے نہ دیکھا
وهی باس، وهی رنگ، سجن تیرے هی جیسا

اری لہر، اری لہر، سجن تو نے نہ دیکھا
وهی ساتھ، وهی سنگ، سجن تیرے هی جیسا

ارے ناگ، ارے ناگ، سجن تو نے نہ دیکھا
وهی گیان، وهی ڈنک، سجن تیرے هی جیسا

* چھیج — ایک سندھی لوک ناچ کی دھن



چندا رے تو میرا یار
ساتھ پھریں آوارہ آ

تیرا میرا گھاؤ وہی ہے
یہ صدیوں کا داؤ وہی ہے

دونوں اندھیارے پر وار
ساتھ پھریں آوارہ آ

تو اور میں دونوں ہرجائی
تو سیلانی میں سودائی

سب سے بیگانے بیزار
ساتھ پھریں آوارہ آ

دل نہیں بھرتا تیرا میرا
لمبا رستا تیرا میرا

دونوں کے ساجن اس پار
چندا رے تو میرا یار



محبت کو کبھی مات نہ دے موت چلی آ
بھئی بھور، کھلی آج رتن جوت چلی آ
چلی آ ری نیا روز نیا سوز چلی آ
چلی آ ری پڑا مینھ، نیا نیہہ چلی آ
چلی آ ری چلی آ

مرے روپ، مرے پران چلی آ ری چلی آ
نیا چاند کرے مان چلی آ ری چلی آ
نئی رات، نئی بات چلی آ ری چلی آ
نئے داؤ، نئی گھات چلی آ ری چلی آ
چلی آ ری چلی آ

لئے لاٹ تکوں باٹ تھکے نین چلی آ
جلے ختم نہ ہو موم، ڈھلی رین چلی آ
مری آس، بجھا پیاس، بھروں اوک چلی آ
محبت کو کبھی مات نہ دے موت چلی آ
چلی آ ری چلی آ



جب تک میری پیت، نہ پورا کر لے یہ سنگیت
ٹوٹ ٹوٹ کر جڑا کرے گی یہ وینا او میت

کبھی کبھی میں نے سوچا ہے، میں ہوں وہ شعلہ
بجھ بجھ کر جو جلا رہے گا، کٹے نہ جب تک راہ

سمے کا دھارا ہم دونوں کو پھر لائے گا سنگ
پیتم کٹیا میں پھر ہوگا مرا ترا اک رنگ

جب جب ہوگی مہک ہوا میں، جب پھولے گا پھاگ
کسی کلی کے من میں بسیرا کرے گا میرا راگ

تو نہیں جانے پیتم، پھر میں آیا تھا پہلے
جاگ ترے پہلے بھی جلی ہے میرے سپنے سے

پھر اک دن مدماتی رُت کی ریت نبھاؤں گا
تیرے جگ میں ڈھونڈھ ٹھکانا میں پھر آؤں گا

آؤں گا، آؤں گا، تجھ کو سپنے کرنے دان
آگ نئین میں، راگ لبوں پر ہے میری پہچان

کڑے کوس

بول تری کیا مرضی

بول، میرے پیچھے آئے گا، تجھے چین سے سونا
نہیں، مرے چولہے چنگاری، نا مری کھاٹ بچھونا
پاس نہیں ہے مدماتی آنکھوں کا میگھ ملہار
دور دور تک دن کی راتیں جب تک جائے نہار
بول، تری کیا مرضی؟ پیچھے سوچ سمجھ کر آ
تو کیا جانے، کیا ہے سولی؟ کیا ہے یہ سودا
تو ہے سیانا، بول، سہے گا گیان کے سو سو گھاؤ
اڑ پائے گا گر میں روکوں ترا پنکھ پھیلاؤ؟
بول چڑھے گا مری چتا پر، سلگن میری جان
جلا کرے گا راکھ نہ ہوگا، کر لے یہ پیمان
گن گن کو میں اوگن سمجھوں گیان کروں اگیان
دھرم کی دھول اڑاؤں پھاڑوں پوتھی پران
پگ پگ کانٹے کروں اکٹھے دیکھ یہ میرے پیر
تو کیوں لاگا میرے پیچھے، واپس لوٹ سویر
پر جو آیا میرے پیچھے کٹھنائی سب جانچے
چن چن کانٹے میں باندھوں گا سہرا تیرے ماتھے
اور تو کچھ بھی پاس نہیں پر دوں گا تجھے پکار
جس کی دھمک سے جڑ سے ہل جائے گا یہ سنسار
سلگ اٹھیں گے جس کی گونج سے جگ جگ کے اندھیارے
اگر پکارنا چاہے تو آ میرے پیچھے پیارے
بول، تری کیا مرضی . . . . .



یوں تو پل پل کھوٹا سکہ
کوئی کوئی پل کنچن کایا
کسی کسی پل کی مٹھی میں
چنری جیسی جیون مایا
یوں تو ریتی پر پھیلے ہیں
کالے پالے، کالے سائے
کوئی کوئی پل بھور سمے میں
پھاگ نکھارے رنگ رچائے
ہاں ہاں کوئی کوئی پل بادل
کومل کومل گیت سنائے
کوئی کوئی پل ان کانٹوں میں
پھیرا بھرے بھنبھوری جیسا
کوئی کوئی پل چنچل چنچل
پیت لگانی چھوری جیسا
ہاں ہاں کوئی کوئی پل نرمل
گنگا جل میں گوری جیسا
کوئی کوئی پل بیاکل بیاکل
چاند کو دیکھ، چکوری جیسا
بھر بھر گرجے، برسے، ڈھالے
موتی سیپ نکوری جیسا



"جہاں برج بادل بنے، گاؤ تم
وہاں میں بھی ہونگی نہ گھبراؤ تم"
کہا یہ بھی جاتے
"کہ وہ برج دیکھو!
ملیں گے وہاں رہ نہ دکھلاؤ تم
گئی بھی تو کیا، روح کا گھاؤ تم"
تو میں نے کہا تھا
"لہو کی ندی کا
نہیں پار کوئی! نہ بہلاؤ تم
گئیں، پھر نہ لوٹیں کبھی، ہائے تم"
تو تم نے کہا تھا
"بچھڑنا نہ ہوگا
جہاں برج بادل بنے، گاؤ تم
وہاں میں بھی ہونگی نہ گھبراؤ تم"



تھر میں کون ٹھکانا رے
تھکوں کا کون ٹھکانا

بالو ساری باٹ
نہ کوئی چھاؤں، نہ کوئی گھاٹ
دھوپ نے چھپر تانا رے
تھر میں کون ٹھکانا رے
تھکوں کا کون ٹھکانا

ملی نہ ان کو چھاؤں
تڑختی ریت پہ جلتے پاؤں
رستا گھاؤ ہرانا رے
تھر میں کون ٹھکانا رے
تھکوں کا کون ٹھکانا

کہاں گھٹا گھنگھور
کہ تھر میں ناچے کوئی مور
گونج رہا ویرانہ رے
تھر میں کون ٹھکانا رے
تھکوں کا کون ٹھکانا

ڈھور ڈھکانا آگ
انہیں بسراتا ان کا بھاگ

ہنستی خاک نے جانا رے
تھر میں کون ڈھکانا رے
تھکوں کا کون ڈھکانا

چے گوویرا کی موت پر

جو جیون آزاد گزارے
موت ہے کیا شے اس کے آگے
پگ پگ پر پنجوڑ جو دیکھے
شیر کبھی چنگھاڑ نہ چھوڑے
باز بسیرے اور نہ دوڑے
ڈر کے ڈھنگ تو گیدڑ جانے
چڑیا دیکھ، جھڑپ ڈرتی ہے
مورکھ! ساری عمر غلامی؟
آزادی پل کی بھی بھلی ہے
تو نے اپنی جیون دھارا
جس پل میں بھرپور بھری ہے
وہ پل صدیوں کی شکتی ہے
اس کی سب سے عمر بڑی ہے
جس نے دن آزاد گزارے
موت ہے کیا شے اس کے آگے



ہے آس پاس دلدل پھیلی
اک لاش پڑی ہے ریتی پر
لوہے کی ٹوپی کے آگے
بندوق پڑی ہے دھرتی پر
اک جنگی تمغہ چمک رہا
میلی سی خاکی وردی پر

گل چکا ہے اس کا ماس مگر
ہیں بوٹ ابھی تک پیروں میں
جب شام پڑی تب کاگ اڑے
چھوڑا پنجر کو ڈھیروں میں
حیرت سے اس کو تکتا ہے
اک زرد پھول کانڈیروں* میں

* کانڈیرے — کانٹے دار جھاڑی



یہ ہے دھگانو خان
کہ جس کا باپ بھی ھاری
بیٹا ھاری
وھی فصل اگتی ہے ساری
وھی ہے جوڑی پر تیاری
وھی ہے ھل اور وھی ہے ریجا *
وھی ہے بیجا †
گاؤں وھی ہے
داؤں وھی ہے
وھی ہے پیر، کڑی اور تھانا
بیٹی کو بھی وھی جمعانا ‡
جس دھرتی کو بیٹا کوٹے
اس دھرتی میں واپس لوٹے
ھاں، پر جس دم سانجھی آئے
گھوڑے کو جس وقت کھلائے
پیال بچھائے
کیا کیا گائے

---

* ریجا — سینچائی
† بیجا — بیج
‡ جمعانا — سندھ میں جمعہ کے دن نو بیاھتا لڑکیوں کو میکے بلایا جاتا ہے

اور ساری لالان * شفق کی
نور بہائے
گھوڑے کی ھنکار ھوا میں
اڑتی اڑتی پر پھیلائے
تب ان دونوں کے تاروں میں
ایک چمک ھے
یوں لگتا ھے
ان دونوں کے نین یگوں کے میت ھوں جیسے
ھاں، یہ ویسا ھی انساں ھے
جُگ گزرے، پر کب بدلا ھے
وھی دھگانو خان
کہ جس کا باپ بھی ھاری
بیٹا ھاری
آج تلک پہلے جیسا ھے
انساں، ویسا ھی انساں ھے

* لالان ــ سندھی زبان میں لالی کے معنی میں مستعمل ھے

اسی کھولی میں دوسرے قیدی سے

وہ قابیل
یہ ہابیل
دونوں ایک ہی کوکھ کے باسی
اک دوجے کے خون کے پیاسے

تجھ کو مصحف پڑھنا ہے
دور ستاروں کی سیڑھی پر
باغ ارم تک چڑھنا ہے
میرے لئے تو دوزخ، کھولی
مجھ کو آئے نیند بڑی

باہر جا
خدا کو مان
پڑھے سو پڑھ
وظیفے کر
بجھا کر جانا یہ قندیل
ہاہا! ہاہا!
یہ قابیل
وہ ہابیل



پھلا پھلا
لفظ خدا کا
کن فیکوں
شاعر، موسیقار مصوّر
سب میں ایک ھی جوش جنوں
کن فیکوں
کلا خزانہ
آ مل بانٹیں
موتی ھیرے
نیلم نیرے
آؤ کریں سنگھار جگوں کے
روک نہ ان کو
ٹوک نہ ان کو
یہ جو سرجنہار* جگوں کے
ان کو اپنے گیان کا امرت
جان بوجھ کر
یوں کم کم مت دے او دھرتی
اتنا غم مت دے او دھرتی

---

* سرجنہار — تخلیق کرنے والا

جیل میں بلیک آؤٹ

جب کھولی پر چاند کھلے
چوٹ پرانی درد کرے
بیڑی سونا جو بھی بھرے
اس پر چوکیدار چڑے

کسی کے من میں دھیان عجب
ہونی ان ہونی سوچے
بمباری کے ڈر سے روز
بجلی یہاں بجھاتے ہیں
پر وہ کھلا ہے پورا چاند
(دن بھی جس کے آگے ماند)
اس کو نہیں بجھاتے کیوں؟
کون بجھا سکتا ہے اسے!



میں دیتا ہوں گیت تجھے او دھرتی
تو دیتی ہے زنجیر مجھے

یہ گیت گُلابی رم جھم کے
یہ گیت شرابی رم جھم کے
یہ ساون کے من بھاون کے
یہ گگن گگن پر آون کے
یہ پیاسے پیاسے موروں کے
ریتی پر کنٹھ کٹھوروں کے
یہ گیت سنہری سندھو کے
اس نیلی گہری سندھو کے
جو سپنے نیلی سانجھی کے
یہ گیت پتن پر مانجھی کے
یہ گیت گھنے طوفانوں کے
یہ گیت اٹل انسانوں کے
یہ گیت رو پہلی بانہوں کے
یہ دوری کے یہ آہوں کے
گھنگھور گھٹا سے جو بن کے
پر شور ہوا سے جو بن کے
یہ گیت رسیلے رنگوں کے
یا جھولے مست امنگوں کے

یہ روٹھنے والی راتوں کے
جو ختم نہ ہوں ان باتوں کے
یہ گیت گھنیرے بالوں کے
یہ گیت یاد کے جالوں کے
ننھی سی دودھ کٹوری کے
یہ گیت بسرتی لوری کے
یہ کبھی ہوا سے ہلکے ہیں
بن رم جھم بدلی چھلکے ہیں
اور کبھی بڑے گمبھیر ہوئے
تاریک کنوئیں کا نیر ہوئے
یہ گیت دھیانی دھرتی کے
اس دانا پانی دھرتی کے
یہ گیت لہو پچکاری کے
یہ گیت گھٹی سسکاری کے
یہ گیت گِدھوں کے پھیروں کے
آندھی میں رین بسیروں کے
یہ گیت بلکتے بالک کے
دھرتی کے منہہ پر کالک کے
مزدوروں کے، مجبوروں کے
اس دھرتی کے ناسوروں کے

زنجیروں کے، زندانوں کے
یہ انگ کڑے انسانوں کے
یہ سولی پر سروانوں * کے
یہ گیت امر پہچانوں کے
یہ گیت کھلے میدانوں کے
اور ان میں پڑے گھمسانوں کے
یہ گیت اٹل آزادی کے
اور بانہوں بل آزادی کے
جو ڈھا دے قلعے غلامی کے
یہ گیت ہیں ہر اس عامی کے

میں نے تجھے کیا کیا گیت دیئے
کیا سپنا سپنا گیت دیئے
میں دیتا ہوں جیت تجھے او دھرتی
تو دیتی ہے زنجیر مجھے

---

* سروان ـــ سندھی میں سربراہ کو کہتے ہیں



یہ گھناؤنی گھڑی
آگ آگ آسمان
چیختی ہے مورنی
مینھہ ، برس
مینھہ ، برس
مینھہ ، برس

رول مت نراس میں
آ ، کہیں کھلی زباں
بے زبان پیاس میں
مینھہ ، برس
مینھہ ، برس
مینھہ ، برس

ھانپتے ملیر میں
ٹھور ٹھور ہے الاؤ
آگ ہر سریر میں
مینھہ ، برس
مینھہ ، برس
مینھہ ، برس

آؤ بجلیو ، گھٹاؤ
اب نہ سہہ سکیں گے تاؤ
آؤ ، آؤ ، آؤ ، آؤ
مینہہ ، برس
مینہہ ، برس
مینہہ ، برس



رات اندھیری، کالی کالک
میں اس ڈوبی نیّا کا اک
بہتا تختہ، بے کل لہریں
پورب پچھم لہریں لہریں

بھنور کو اس کے کان نہ سمجھو
یہ بہرا منجدھار نہ جانے
کیسے مر گئے سارے مانجھی
کہاں گری پتوار نہ جانے
کیسے ڈوبے ڈوبنے والے
کیا تھی انت پکار نہ جانے

دور افق میں پہلے سب نے
سپنوں کے سنسار کو دیکھا
پون پون نے کھول جھروکا
کس کس روپ نکھار کو دیکھا
لہروں لہروں کی چھاتی میں
کس نے اس اندھکار کو دیکھا

دھارے کا رخ کوئی نہ سمجھا
کس نے جانا قہر یہ ہوگا
جب طوفان اڑائے تختے
کیسا لنگر، کیسا لوہا
بزدل تھا ہر ایک کھویاّ
سب نے بیچ بھنور میں چھوڑا

گزریں دھوپ ۔ سنہری لہریں
اب ہیں کالی گہری لہریں
گونگے تختے، بہری لہریں
پورب پچھم قہری لہریں



تو جو مرے بعد آئے
جب کینجھر* سے کارونجھر تک دھرتی گیت سنائے
میری یاد دلائے
سندھڑی ساری تب تک لال چنریا سی ھوجائے
پھلکاری پھلکاری میری کلا جو روپ دکھائے
کاش تجھے سمجھائے
دھول کلا کی شان
سچ کی آن بڑی شے ھے
اور جو سچ میں سمایا
وہ امکان بڑی شے ھے

* کینجھر — ٹھٹہ کے قریب سندھ کی مشہور جھیل



میں تو گایک ہوں مہمان
تیری سورٹھ* کا وردان†
نہ کوئی سنگی، نہ کوئی یار
پھر بھی آیا کیچ کے پار
سارے ناز چنیسر کے
چھوڑے لیلا ترے لئے
میری مومل، کھڑکی سے
دیکھا نہیں کبھی نیچے
پہنچا کاک کنارے کون
کھل کر تجھے پکارے کون
میں جو ونجھلی آج بجاؤں
تخت ہزارے کئی گراؤں

(کلا، کل مونہی، سدا جلے
بجلی مرلی بیچ پلے)
پوری تان جو میں گالوں
کتنے جھنگ جلا ڈالوں

---

* سورٹھ ـــ رائے ڈیاچ کی بیوی
† وردان ـــ شوہر کی جان بخشی کرنے والا

پر میں کیسا رانجھا ہوں
ہیر کے ہاتھوں زہر پیوں
میں کیسا میہار۔۔۔ الا!
کھڑا رہوں اس پار، الا!
بھیگی راتوں کے پل چھن
روک رکھے تیری کارن
تجھکو سہنی، سدھ، نہیں؟
گھڑا نہیں کوئی مدھ نہیں
دیکھ، کے ڈم* کی قہری گھات
آئے گی اٹھ کر آدھی رات
پھینکا میں نے مدرا گھونٹ
آج ادا سے چاروں کھونٹ

میرے بھاگ بھٹائی کے
سارے راگ بھٹائی کے
لیکن آج یہ اک تارا
لگتا ہے یوں ناکارہ
جی کرتا ہے دے ماروں
ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالوں

---

* ڈم ــ سندھی لوک کہانی میں سوھنی کا شوہر

بھٹ کو واپس لوٹا دوں
ایسا بے بس لوٹا دوں
یہ پھر کبھی نہ بج پائے
مٹی میں ہی مل جائے
بھٹ کی سوندھی مٹی سے
کوئی بھٹائی نہیں اٹھے
کوئی بھٹائی نہیں اٹھے



ترازو ہیں آنکھیں۔ . . .
ہماری ترازو ہیں آنکھیں
کہ یہ دیس، وہ دیس دونوں ہی کھوٹے
مگر پھر بھی پیارے
ترازو ہیں آنکھیں!

بہانے سے پلڑا جھکانا نہ جانیں
کبھی جھوٹ سے یہ نبھانا نہ جانیں
گنوں کی جو ڈانڈی اُٹھائیں تو جانچیں
سدا دیس کی دیس سے تول پوری
کبھی منصفی میں
خیانت نہ کی لا شعوری، شعوری
کبھی ڈھول سے دھن نہ تولیں، نہ تولیں
نہ کافر، نہ مومن، سدا پیت رو لیں
جہاں بھی گئے سب خریدار کھوٹے
محبت سوا سب طلب گار کھوٹے
برہ کا بنج* ہم بتائیں تو کس سے؟
بہا درد دل کی جو پائیں تو کس سے؟

---

* بنج — بیچنے کی چیز/دن

کہو سچ کا بھی کوئی بازار ہے کیا؟
کوئی دردِ دل کا خریدار ہے کیا؟
خدائی میں لوگوں کی کوئی تو ہوگا
کہ یہ دیس
وہ دیس دونوں ہی کھوٹے
مگر پھر بھی پیارے
بھلائی میں دونوں کی کوئی تو ہوگا
ہماری طرح آج جس کی
ترازو ہیں آنکھیں ....



اس دیس پہ یرقاں چھائی ہے
ہر شام یہاں پیلی پیلی
کیا لیموں جیسی آئی ہے
اور اسکی کالی کال میں
کیا وحشت، کیا تنہائی ہے
اس دھرتی پر اک دیو پھرے
یوں جس نے خاک اڑائی ہے
اور ہاڑ چبا کر انساں کے
گھر گھر میں راڑ مچائی ہے
سسکی بھی یہاں بھیانک ہے
لوگوں نے جیبھ کڈائی ہے
کوئی جھلکی نہیں جھروکے میں
ایسی ہیبت پھیلائی ہے
ہر اور خموشی مرگھٹ کی
ہر شام کی ارتھی آئی ہے
پر تجھ سے یہ سب کیا کہنا
کہہ کر بھی بات گنوائی ہے

اس دیس پہ یرقاں چھائی ہے
اس کے ہر جاگ اور سپنے میں
اک ہلدی سی پکجائی ہے
اڑ گئے پکھیرو ڈار دکھی
اک کونج نہ لوٹ کے آئی ہے
سورج بھی کڈّا ڈالی ڈالی
یوں آری کوئی چلائی ہے
ہر پل راکاس گرجتا ہے
تونے کیا آس لگائی ہے؟
کوئی چھاتی ہے اس دھرتی پر
کچھ شکتی جس میں سمائی ہے؟
وہ پھول کہاں ہیں جن کے لئے
تونے جھولی پھیلائی ہے؟
کس بھور سمے کے سپنے میں
یوں اتنی عمر بتائی ہے
پر تجھ سے یہ سب کیا کہنا
کہہ کر بھی بات گنوائی ہے



اچھا اب میں چلا بھائی —
میں تیرا احسان بھلادوں
یہ تو ناممکن ہے، سائیں!
تو تو ہر نربل کا سہارا
سنگ سدا تیری پرچھائیں

ساحل پر بےہوش پڑا تھا
کوئی لہر بہاکر لائی
اس دم تونے کی جو مجھ سے
کیسے بھلاؤں ایسی بھلائی

مجھ کو دوجا جیون بخشا
سانسیں پھونکیں مت دے ڈالا
شب بھر میرے سنگ رہا تو
بھور کا تارا مجھے دکھایا

لیکن دیکھ ابھرتی لہریں
کوئی سپنا جن کے اندر
بھر آئیں گھنگھور گھٹائیں
بپھرا ہے پر شور سمندر

وہ ساگر کی ماں سی گودی
لہر ہنڈولے میں وہ لوری

جگر مگر تھے کتنے تارے
گھاٹ پرے چمکی تھی ریتی

پچھلی رات پون نے کیا کیا
جڑے تھے نگ تیری ریتی پر
تجھ سے سدا نبھاؤں سائیں
وچن کیا تھا جو کھیتی پر

لیکن آج مجھے جانا ہے
طغیانی میں، طوفانوں میں
اس رُت کی ہے ریت نرالی
شور کرے جو شریانوں میں

دور ہو کتنا ہی وہ ساحل
پر سنتا ہوں اس کی صدا میں
جو نیّا تونے جوڑی تھی
آج اسی پر دور چلا میں

اچھا اب میں چلا بھئائی



او نیند ابھاگن، آ نہ ابھی
ہے ابھی ادھورا گیت مرا

اے لہروں لہروں نیند ابھی
میں اپنی نیّا جوڑ رہا
اور تیرے اندھیارے تٹ پر
پل بھر کو لنگر چھوڑ رہا

یہ تیرا بھیانک اندھیارا
جو سب کا جی دھلاتا ہے
پر وقت کا بے صبرا مانجھی
کب روکے سے رک پاتا ہے

یہ بادبان سپنوں کا مرے
میں اس کا کس بل پرکھ رہا
جو مہلت ملی غنیمت ہے
آخر ٹھہرا سب کو جانا

ہے وقت کا مانجھی بے صبرا
پل میں پتوار اٹھائے گا
اور ناؤ ڈبوتی آندھی میں
مجھ کو کھیتا لے جائے گا

اے نیند ابھاگن، ابھی نہ آ
ہے ابھی ادھورا گیت مرا



یہ کیسا قہر کیا تو نے
شیشے کے بند دریچے میں
کیوں یہ گلدان رکھا تو نے

جب شیشوں سے شبنم پونچھے
دیکھا ہے کبھی ان پھولوں کو
نظروں میں ہیں کیا کیا شکوے؟

ہر پھول ہے جیسے آنکھ، کوئی
شیشے کے بند دریچے سے
جو بھونرا بھونرا دیکھ رہی

کوئی نیر نہیں ان میں باقی
اور کھڑکی کے شیشوں کی طرح
بے جاں لگتی ہے کلی کلی

تو کھول بھی دے یہ بند دری
کیسا پروئیا ہے اوس بھری



جھکا تھا دن ڈاچی* جیسا
جگ مگ تھی سانجھی کی جھول
گھر سے باھر کھیتی میں
کیا کیا تھے خش خش کے پھول

اس لالان کو نینوں نے
رنگ شفق میں تاڑا تھا
کل گلنار بدریا پہ
میں نے تنبو گاڑا تھا

پھر ھتیارے آ پہنچے
کھولیے اپنی ھتھ کڑیاں
بھول نہیں سکتا ساتھی
کیا گھنگھور تھیں وہ گھڑیاں

لگا تھا جیسے کوئی گڑھا
آیا میری اور بڑھا
اور راکاس سا منہ پھاڑے
جھپٹ کے مجھ کو نگل گیا

---

* ڈاچی — اونٹنی

سرخ شگوفے خش خش کے
کل تو نشے کے پیالے تھے
آج بکھر کر لگتے ہیں
میرے لہو کے چھینٹوں سے

سانجھی یاد دلاتا ہے
ڈھلتا سورج، ہاتھ سے کڑی
جس میں قید گزرتی ہے
کوئی سر جنہار گھڑی



یہ سفر نہیں کٹ پائے گا
اے رن کی رات، اندھیرے میں
میرا سپنا مٹ جائے گا

ہاں، کبھی ستارا گاتا ہے
رستا چمکا کر پیروں کو
کچھ دھیر بندھا، دوڑاتا ہے

اور کبھی گھٹا کی گھاٹی میں
یہ کالا افق پہاڑ بنا
لگتا ہے چوما چاٹی میں

کوئی ڈائن جیسے چمکارے
دوجی ڈائن کو پیار کرے
اور پربت بیچ دراڑ پڑے

اس وقت گھٹا میں تکتا ہوں
اور جانچ کے چھالوں کی لالی
میں زخمی نین جھپکتا ہوں

دل سہم سہم کر کہتا ہے
یہ سفر نہیں کٹ پائے گا
کیا اب بھی نہ پیت بھلائے گا



بیٹھ کے نیم تلے کل میں نے یہ سوچا
میں بھی ہوں اک پیڑ، نیم بوٹے جیسا
میری نمولی میں بھی بس سی کڑواہٹ
پنچھی پنچھی جن میں چونچیں مار رہا
کیا کیا ٹھنڈی چھاؤں ڈالتا دھرتی پر
پھر بھی مجھ پر دھوپ کا پڑتا وار کڑا
اس بنجر دھرتی پہ، اگر میں چاہوں بھی
نیم رہوں گا، اور نہیں کچھ بن سکتا
بیٹھ کے نیم تلے کل میں نے یہ سوچا
میں بھی ہوں اک پیڑ، نیم بوٹے جیسا



وہ سورج ڈوبا، پیالے میں
بھر دیا کسی نے لال لہو
سب گھونٹ گھونٹ جو پیتے ہیں
اور جیتے ہیں!
لو رات ہوئی، ہر تالو میں
تارے تارے کا تیر چبھا
سب اپنی تڑپ چھپاتے ہیں
اور گاتے ہیں!
تو نہیں ہے تو! میں نہیں ہوں میں!
ہم کیا ہیں! کیوں ہیں! کس سے کہیں



کتے بھونکے
مکھیا بھونکے
چور بھی بھونک رہے
کیسی ہے چنگھاڑ ہوا میں
لپکے کوئی دھاڑ ہوا میں

رستے چونکے
تارے چونکے
چونکے ہر دیوار
کون اویرے* یوں آیا ہے؟
اس بستی میں کیوں آیا ہے؟

---

* اویرے — بے وقت



یہ شہر بھی جیسے بابل ہے !

گھر گھر میں کنڈ گناہوں کے
دل دل میں چکلے چاہوں کے
محراب وہی، مندر بھی وہی
ہیں شور جہاں گمراہوں کے
ہے فرق ذرا سا، اور وہ یہ
یاں جو بھی فرشتہ ہے آیا
معصوم ہو پھر یا مجرم ہو
ہے اس کو کنویں میں لٹکایا

یہ شہر بھی جیسے بابل ہے !



اک سپنا ڈھل کر چھنتا ہے
اس تنبورے کے تاروں سے
تو چندرما کی ناؤ لئے
جب نکلے دور ستاروں سے
اور میرے سرھانے بیٹھ، مرے
بالوں کو تو سہلاتی ہے
پھر تنبورے کے تاروں پر
تو مجھ کو گیت سناتی ہے
جو گیت امارو نے ڈھونڈا
جو کالیداس کو مل نہ سکا
کل رات روی سمپان * لئے
جو گیت ادھورا گاتا تھا
سندھو دھارے پر آج مری
ہر کوتا ایک پہیلی ہے
سب مانجھی مجھ سے پوچھ رہے
"یہ لہر کہاں سے آئی ہے؟"
اس دم حیرت سے تکتا ہوں
میں تنبورے کے تاروں میں
اور یاد انگلیاں آتی ہیں
پھرتی ہوئی اپنے بالوں میں

* سمپان ــ بنگلہ میں ایک مخصوص کشتی کو کہتے ہیں



اڑو، کنویلیو*، اڑو
مرے سجن سے جا کہو
ابھی تو جی رہا ہوں میں
ابھی تو جی رہا ہوں میں

اجوگ میری باٹ ہے
رتوں کا دل اچاٹ ہے
جو ایک دو قدم چلوں
تو پات جھڑ پڑوں
سینہہ† ہے نہ سنگ ہے
نہ آس میں امنگ ہے
مگر میں مار دھاڑ میں
اجاڑ باڑ باڑ میں
بھڑک بھڑک کے لڑ رہا
تڑپ تڑپ کے بڑھ رہا

اگر میں کام آ گیا
گرا کے چار نیر تم
کبھی کبھی یہ سوچنا
کہ کون راہ میں گرا

* کنویلیو — کاگ
† سینہہ — پیار

گھٹائیں جب بھی جھوم کر
گگن کو چوم کر
گلی گلی برس پڑیں
بنوں میں مور ناچ اٹھیں
بھرا ندی کا نیر ہو
کوئی ہرن جو سیر ہو
تو اس سمے نہ بھولنا
کہ کون پیاس میں مرا

ابھی تو جاگ جل رہی
ابھی لڑائی چل رہی
ابھی تو گھاؤ تاؤ میں
لہو لہو لگاؤ میں
بھڑک بھڑک کے لڑ رہے
تڑپ تڑپ کے بڑھ رہے
ابھی ہے نین میں چمک
ابھی تو دل رہا دھڑک
ابھی گھڑی گئی نہیں
کہ رات ابھی ہوئی نہیں
ابھی تو جی رہا ہوں میں
ابھی تو جی رہا . . . .



بات جو تو نے سوچی ہے
حرم سرا کی سوچی ہے
بھاپ نہ جسکی باہر آئے
ہنڈیا دل ہی دل میں پکائے
خواجہ سرا بنا بیٹھا ہے
ٹھگی کے پھندے گانٹھ رہا ہے

بات جو میں نے مانی ہے
وہ جھانسی کی رانی ہے
جس کی تیز کٹاری ہے
وار بھی جس کا کاری ہے
اس کے لئے میدان بھی ہے
جیون کا جولان بھی ہے
اس کی جان کو جوکھا ہے
پر جو گیت انوکھا ہے
اس کی بغاوت لافانی
بات، جو ہے میں نے مانی

بات جو تو نے سوچی ہے
رن میں کام نہ آئے گی
گھٹ گھٹ کر مرجائے گی

تو بھی "وطن کا شاعر ہے"
پر چالوں میں ماہر ہے
میرے سچ کو خوب سمجھنا
پھر بھی ہر اک سے یہ کہنا

"یہ کس دنیا میں رہتا ہے
پتھر سے سر مار رہا ہے"



کل جو تمہاری چوٹی میں
میں نے پھول لگایا تھا
پھول کی خوشبو چوٹی میں
یا چوٹی کی پھول میں تھی
کون پھول تھا یاد نہیں
ہلچل یہاں مچی ایسی

کون پھول تھا یاد نہیں
شاید کوئی چنبیلی تھی
یا چمپا تھی چوٹی میں
رنگت جس کی پیلی تھی

آج مجھے کچھ یاد نہیں
زنداں کی فریادوں میں
بے بس من کی جگہ کہاں
مہکی مہکی یادوں میں

کل جو تمہاری چوٹی میں
میں نے پھول لگایا تھا



'تو کون؟'
'ارے میں رومی ہوں!'
'اے رومی، فرصت نہیں مجھے
پھر کبھی سہی، پھر کبھی سہی'
'تو کون؟'
'ارے میں تلسی ہوں!'
'او تلسی، فرصت نہیں مجھے
پھر کبھی سہی، پھر کبھی سہی'

اس پتھر میں آخر میں نے
ڈورا ڈالا، اور جان پڑی
نکلا ہے روپ تصور کا
ہنستی ہے آج مری دھرتی

اس ہنسی کو اور سنورنا ہے
کچھ رنگ ابھی تو بھرنا ہے
اس روپ کو اور نکھرنا ہے
مجھ کو یہ کام تو کرنا ہے

اے رومی، فرصت نہیں مجھے
اے تلسی، فرصت نہیں مجھے
پھر کبھی سہی، پھر کبھی سہی
او راگی، فرصت نہیں مجھے

امیر خسرو پنہاری سے

"تیرا ناؤں ؟ کانتی
تیرا روپ انوپ ہے
میرا رنگ نہ روپ ہے
تیری صورت سانوری
تو کیا جانے بانوری
من منڈپ کی آگ ہے
تیری کایا کانتی"

"میرا ناؤں کانتی
میرا بھیس بنارسی
بولی تیری پارسی
میری بولی پوربی
اور میں پوجوں مورتی
تیرا من گھنگھور ہ میں
چندرما کی شانتی"

"شترو * سمجھ نہ کانتی
یہ میرا بھی دیس ہے

---

* شترو — دشمن

نوٹ :۔ اس نظم کا ترجمہ شیخ ایاز نے خود کیا تھا جو رسائل میں شائع ہوچکا ہے

کتنا گہرا گیروا
میرے تن کا بھیس ہے
تیرے میرے گاؤں کا
اپنا اپنا تھانولا
لیکن ان کے بیچ میں
پانی تو ہے ایک سا
میری اچھی کانتی
میں تو ہوں ویدانتی"



کل جو سنجاب میں سجی لپٹی
کار سے ایک نازنیں اتری
گود میں تھا سمور سا کتا
چال میں رقص، ڈھال میں نرمی

روپ، شو کیس میں سجائیں جسے
رنگ، جیسے کوئی کلی نرمل
پیر جیسے پدم، کنول سے ہاتھ،
اور آنکھیں بھونر بھونر چنچل

یوں ٹہلتی دکان تک آئی
سب نگاہوں کا اشتیاق بڑھا
میز سے کیک کو اٹھاتی تھی
کہ یہ دیکھا کہ ہے کوئی آتا

پاس فٹ پاتھ، پر کوئی لڑکا
ہاتھ، پھیلائے بھیک کو آیا
آنکھ میں کیچ، پیر سے ننگا
بال بکھرے، پھٹا پھٹا کرتا

رحم دل میں بھرے اتر آئی
ایک آنا نکال کر بولی
"ہاں، کہیں چرس کی نہ لے گولی!"
پھر ہنسی اور دکان میں لوٹ گئی



لاڑ* کی ناری
چھاج پھٹکتی
ناج پہ اڑ اڑ کر منڈلاتے
کاگ جھٹکتی

اس کے تینوں بالک بھوکے
روتی بچی
سوکھی ندیا
جلتی کھیتی
'دیکھ، وڈیرا آ جائے گا'
مچلیں بالک انہیں ڈرانا
کرے بہانا

بھور نکلتی
سانجھی ڈھلتی
لاڑ کی ناری
چھاج پھٹکتی

* لاڑ ــــ سندھ کا زیریں حصہ



شام کا دھام، ڈوبتا سورج
سوکھے ٹکڑے چبا رہا جیسے
جھول، گیرو رنگے بھکاری کا
پیڑ سوکھا ندی کے پاس کھڑا
جیسے بھوکے کا پیٹ ہو سوکھا
اور روٹی سا پک رہا سورج

لڑائی کے بعد

باڑے میں ہوگئی لڑائی
دھان بھری اک گاڑی پر
چاند گھٹا میں لکتا چھپتا
گاڑھا خون کلہاڑی پر

لال لہو میں ڈوبا ڈوبا
توری بیل کا پیلا پھول
ہوا درختوں میں روتی ہے
ہائے کسانو، کیسی بھول

پٹّے پہنے کتے لے کر
تھانیدار بھی آ پہنچے
اپنی پیاس بجھانی جن کو
لال لہو کی پیالی سے

جس نے اس کو دیا نہ حصہ
مجرم ٹھہرا بس وہ ہی
چاند دیکھتا میں جھکا کر
لین دین ہر پائی کی

مجرم تھا پر دور وڈیرا
بیٹھا ہنستا ماڑی پر
چاند گھٹا میں لیرے لیرے*
گاڑھا خون کلہاڑی پر

* لیرے — چیتھڑے



میری جھولی میں آ تو گاؤں میں
چاند! تو آج کچھ اداس سا ہے
نور سے اپنے کچھ نراس سا ہے
تجھ سے باتیں کروں محبت سے
کھاؤ تیرے سیوں نفامت سے
تیرے منھ سے گھٹا ہٹاؤں میں



سیر سنسار کی میں کرتا ہوں
آسمان دور کب ہے، بس اک گام
پی لیا میں نے ماہ تاب کا جام
توڑ تارے بھری ہے یہ جھولی
دیکھ، کیسی سجائی ہے بولی
زندگی، تیرے آگے دھرتا ہوں



میرے گیت ہزار گگن کے
پنچھی بن کے
بل نا گن کے

ہر اوہ اپنے خوں میں نکھرتی
گھایل دھرتی
تجھہ کو اربی

میری کوتاہ جاپ جُگوں کا
ان گایا آلاپ جُگوں کا
کاش میں دھودوں پاپ جُگوں کا



یوں تو وڈیرا 'شان' رہے
اوپر کی دھتکار تو اس کی چڑیا جیسی جان رہے
یوں تو وڈیرا ناگ رہے
بگڑے گر سرکار، سپیرا بن کر کرتا سوانگ رہے
یوں تو وہ راکاس رہے
مگن ہوئے سرکار تو سمجھو کرسی کی ہے آس رہے
یوں تو بدبودار رہے
مجلس میں آتا ہے لیکن چھڑکے عطر ہزار رہے
حرم تو اس کے ہزار رہے
لیکن ہے لاچار کہ اس کی جورو ہے بیکار رہے
لال ہے اپنا کھیل رہے
لال لہک کو دیکھ لیا تو مچل گیا ہے بیل رہے
لال ہے اپنا کھیل رہے
ہمارے وڈیرا بیل رہے



کالا کاگ، ڈھلی پونم میں
مری منڈیری ڈولا ہے
مجھ کو گپ چپ گھور رہا ہے
یوں تو بڑا بڑ بولا ہے

شاید سوچ رہا ہے میں نے
گیت ادھورا گایا ہے
انگ انگ مدماتا میرا
شاید اسے نہ بھایا ہے

جیسے کوئی گونگا قاصد
جس نے بھید نہ کھولا ہے
کالا کاگ، ڈھلی پونم میں
مری منڈیری ڈولا ہے



اے ہم وطنو، تم پر پھر میں کیوں نہ ہنسوں
روز و شب کہسار
کہ تم رہوار
رکے اس پار
دیکھتے طوفاں کے آثار
مگر اس پار، نہ تم میں کوئی بھی جانے پائے کیوں؟
اے ہم وطنو، تم پر پھر میں کیوں نہ ہنسوں
روز و شب جی جان
نشے انسان
دکھا جولان
ہو گئے پار بڑھا کرمان
اور ان کی شان، فقط میں آج یہاں منظوم کروں
اے ہم وطنو، تم پر پھر میں کیوں نہ ہنسوں



دل کیا کہتا ہے، کیسے کہوں
گر جل کا پجاری سپنے سے
جاگے، اور شور سمندر کا
اس پر سچائی کا وار کرے

جب سندر ناری پھول لئے
پہنچے، تو پروہت مندر کا
پٹ کھولنے سے انکار کرے

میں اپنے دیس کے آگے جب
اندر کا دکھڑا روتا ہوں
وہ الٹا مجھ پر وار کرے
دل کیا کہتا ہے، کیسے کہوں



دھو دھڑام
آف علام!
سیج پر غریب کی
آنکھ لگ گئی کہیں
آہ بدنصیب کو
کچھ خبر ہوئی نہیں
بادشاہ کا پلنگ
نرم نرم، رنگ رنگ!
چیخ کر گئی کنیز
"پاندان! پاندان!"
نیند ہے عجیب چیز
خواب میں رہا جوان
چوبدار پل پڑا
تب کہیں غلام اٹھا
آسمان اور زمین
جیسے گھومنے لگے
کسطرح کرے یقین
خواب سا اسے لگے
ایک شور ہر طرف
نامراد یہ مجال!

شاہ اس پلنگ پر
سو چکا ہے ماہ و سال
تف تری امنگ پر
'آہ نفسِ سگ مثال!'
لعنتیں کرے ضمیر
لات مارتا وزیر
دھو دھڑام
اف غلام!

هیروشیما

یہ کون کھڑا ہے پربت پر؟
حیران ہوا میں ہنستا ہے!
اور تکتا نیچے دھرتی پر

یہ کیسی آگ لگی جل میں...
کیا اپنا موتی ساتھ لئے
ہر سیپ جلی ہے ساگر میں؟

کس نے ہلکی مٹھی نوشی میں
'میں تیری ہوں' 'میں تیرا ہوں'
کل رات کہا سرگوشی میں!

اس لہجے کی جھنکار کہاں؟
جو پیت کی آنچ سے کھلتی تھیں
ان سیجوں کی مہکار کہاں؟

یہ کس نے کہا، ہے پیار امر!
دوجی ہر شے آنی جانی

اس آگ میں کچھ بھی امر نہیں
اور تجھ میں لئے ترا موتی
جل گئی کوئی سوندھی سیپی
بجھ گئی ترے جی کی جوتی

اور میری پیت گنوائی ہے
اپنی ہر آس امرتا کی
ایسی ارتھی اٹھوائی ہے

یہ کون کھڑا ہے پربت پر
یہ دیکھو، یہ میں ہوں، تو وہ ہے
جو امن نہ لائے دھرتی پر
یہ اپنی ارتھی آئی ہے
اور اس ارتھی پر پھول چڑھا
کیا ہم نے آگ لگائی ہے



گھایل سوار کو
کالے کمیت * تو
کس اور لے جا رہا ہے ارے
اونچی پہاڑی، خیمے نہ ڈیرے
دھندلائی راہیں، ٹیلوں کے گھیرے
پتھر نکیلے، ترچھے تکھیرے †
سانجھی اڑائے خونی پھریرے
اب شہریار کو
کالے کمیت تو
کس اور لے جا رہا ہے ارے
جھکڑ ہوا کے کنکر اڑائیں
جمگھٹ گدھوں کے پر پھڑپھڑائیں
گھایل کو تاڑیں، چکر لگائیں
اور گھاؤ اس کے اب کھلتے جائیں
اس بے قرار کو
کالے کمیت تو
کس اور لے جا رہا ہے ارے

---

* کمیت — سیاھی مائل سرخ رنگ کا گھوڑا
† تکھیرے — تیکھے کے معنی میں سندھی میں مستعمل ہے



گھومتا ہوں دھار پر تلوار کی
اس دھار سے تھوڑا پرے
ساجن مجھے پائے گا وُو.....

آسماں پر چاند جھک کر کہہ گیا
جا جا! سجن کی وہ گلی
کوئی نہ پھر جائے گا وُو....

غم نہیں کر پاؤں میرے چھل گئے
یہ وقت ہے، یہ وقت ہے
واپس نہ پھر آئے گا وُو....



سانجھی بیٹھی اپنے منہہ سے دھول کا گھونگھٹ کھول
گیان ستارے اگے افق میں، چمکے سون سمان
گایک جلتی رکھیو اِس مشعل کی لاٹ اڈول *
پہچانیں گے باٹ بھی اپنی یہ بھٹکے انسان

جگ بیتے پسر اپنے اندر شیر نہ کرے دھاڑ
یہ بھی غنیمت ہے کہ کہیں کوئی لہرائی ہے کوک
کبھی تو بادل برسیں گے برکھا بھی کرے گی راڑ
کبھی کڑک کر گرج اٹھے گی آندھی سی مخلوق

جان سدا جکڑی نہ رہے گی اور بڑھا دے جور
کسی کی چھاتی چاؤ بھری ہے، ترچھا کر لے تیر
گریں گی دھوکے کی دیواریں، لگا ذرا جو زور
نربل ہاتھہ بڑھے تو ہوگی ذرا ذرا زنجیر

پیس کے دانت اٹھیں گے جو ہیں نیر بہاتے آج
گھٹا بنی طوفان تو دیکھو گے قہری انداز
پگ پگ میں اک بجلی ہوگی، لرز اٹھے گا تاج
تو بہرا ہے میں سنتا ہوں قدموں کی آواز

تو اندھا ہے! دیکھہ رہا میں گرج چمک کا کھیل
تو پا لے اندھیارے گھس کر اپنے ڈربے میں

---

* اڈول — نہ ڈولنے والی

کہیں تو ہوگا رن میں رتھ، پر تیرا میرا میل
میرے گھوڑے کے سم تجھ کو کچل کے چھوڑیں گے

مجھے پتہ ہے، مجھے پتہ ہے، آگ ہے میرا گیت
بھڑک بھڑک کر بھنبھٹ † ہوگا، جلے گا ایک جہان
آخر تیری ہار لکھی ہے، آخر میری جیت
میرے دیپک راگ سے اب ابھرے گا نیا انسان

† بھنبھٹ ــ بھڑکتے شعلے



اس کولہو کے بیل نے آخر کبھی ہے یہ بھی سوچا
کیوں آنکھیں بھی بند ہیں اس کی جسم بھی ماندا ماندا
ساری پیٹھ پٹی زخموں سے، سڑ سڑ گھومے کوڑا
اس کولہو کے بیل نے پل بھر تھم کر یہ بھی سوچا

روکھی سوکھی پر راضی ہے، سردی گرمی کھائے
چابک کا عادی ہے، من میں میل نہ اس کے آئے
کاش کبھی رک جائے، سنبھل کر زور سے سر ٹکرائے
اینٹ سے اینٹ بجا کر اس کولہو کا چکر ڈھائے

آخر کب تک جگ کی چکی رہے گی اوندھی چلتی
رہے گی کب تک یوں دھرتی کی گھایل چھاتی چھلتی



رینگ رینگ پٹّے پر پہنچی، تھک کر کھڑی ٹرام
ہانپ ہانپ کر دھواں نکلتا، دم دم کہتا "دام!"
دھک دھک کر چمنی کے دل کو آیا آرام
لپٹ گئی ہے اندھیاروں سے گدلی گدلی شام
بلب بلب پر پھریں پتنگے جگمگ جگمگ جام
جھوٹا کانچ جلائے کیسے! خام، محبت خام!
اک کھٹ کھٹ پر دوڑ پڑے پھر سو گمرہ گمنام
رینگے جائے گا جگ کب تک سسکے جائیں عوام
تھک کر کھڑی ٹرام . . . .



او پردیسی، او پردیسی
کون ہے تیرا دیس؟

تجھے نہیں پہچانے کوئی
دھن بھی تری نہ جانے کوئی
کس کی کارن لے اکتارا
گاتا پھرتا مارا مارا
لوگ یہ کیسے تیرے ہونگے
ترے لہو سے لال رنگیں گے
گیروا تیرا بھیس

او پردیسی، او پردیسی
کون ہے تیرا دیس؟



آرزو کی اداس نگری میں
شام الجھی ہوئی لٹیں چھوڑے
ایک بیوہ کی شکل آئی ہے
زندگانی کا جام خالی ہے
گرچہ ہر سمت جام خالی ہے
سوچتا ہوں، نئی شراب بھروں
اپنے کوزے میں آفتاب بھروں

آس ابھرے نراس نگری میں
آرزو کی اداس نگری میں



آمر! بھاؤ مرا کیا پوچھے!
میرے گیت کو آنک سکے گا؟

ٹوٹے کیا کیا غول دکاں پر
سب ہیں موتی مول یہاں پر

بڑھا ہے کیسا بھیڑ بھڑکا
آگے پیچھے، دھکم دھکا

کیسا بھاؤ چڑھا ہے یارو!
سب نے گیت پڑھا ہے یارو!

تیرا گھونٹ پیا ہے سب نے
بھر بھر اوک لیا ہے سب نے

دھن دولت کے لاکھ پجاری
راکھ میں ایک نہیں چنگاری

کلا بھرے بازار بیچ دی
جیسے ننگی نار، بیچ دی

میں بھی ٹھہرا اک بنجارا
پر میں نکلا سب سے نیارا

گیت کے اندر جو گونجی ہے
بس وہ شے میری پونجی ہے

مل میں جو مزدور گیا ہے
ہل پر ہاری جہاں تھکا ہے

یا جو آیا سینہ تانے
پھر کوٹھڑی میں تیرے آگے

ان سے گیت بناؤں بیٹھا
چوراہے پر گاؤں بیٹھا

جس کے پاس کوئی آنسو ہے
میرے گیت کا وہ مالک ہے

امر! آنسو پاس نہ تیرے
میرے گیت کو کیا آنکے گا



دیکھو جگ منڈی کے کھاتے!

ہر یوسف کے دام لگے ہیں
دامن چاک زلیخائیں ہیں
پیت ہے مہنگی اس منڈی میں
سستے بھاؤ ضمیر گیا ہے
سچائی تھی ایک بھکارن
جس کو کچھ بھی نہیں ملا ہے

قیس کرے لیلیٰ کا سودا
بیچا ہے فرہاد نے تیشہ
چپکے سے ہے تخت پہ بیٹھا
راج ملا ہے تاج ملا ہے
شیریں گئی تو جائے بلا سے
دیکھو جگ منڈی کے کھاتے!



دور ابھی تو ہے آنے والا طوفان

تیز ہوا کا جھکڑ پیڑ جھنجھوڑ گیا
چھن چھن سوکھے پات بکھر گئے دھرتی پر
کھڑ کھڑ کھڑ کھڑ چھکڑا بولے رہ رہ کے
پھر بھی ابھی تو پہیہ گھومے دھرتی پر

ٹوٹے پھوٹے چھکڑے میں کیوں جائے رے
کیوں ناکے پر رک رک جائے رے
لیروں بھری گٹھریا کا ہے سنگواتا*؟
ٹھٹک رہا ہے گھڑی گھڑی ٹھوکر کھاتا!
دور ابھی تو ہے آنے والا طوفان

لیکن اس کو آنا ہے، وہ آئے گا
تیز ہوا کے گھوڑے پر زناٹے سے
یہ پھرتا پہیہ ٹکڑے ہو جائے گا
اس دھرتی پر وہ گھمسان اٹھائے گا
تری گٹھریا جھکڑ میں اڑ جائے گی
اچھا ہو جو سارے وہم مٹائے تو
وہ آئے گا تیز ہوا کے گھوڑے پر
اچھا ہو جو اس کا ساتھ نبھائے تو

---

* سنگوانا — سمیٹنا

منظوم ڈرامہ

دودو سومرو کی موت

دودو سومرو سندھ کا حاکم تھا اور چنیسر اس کا چھوٹا بھائی تھا۔ چنیسر خود بادشاہ بننا چاھتا تھا، اس لئے اس نے علاءالدین خلجی کے ساتھ مل کر سازش کی اور سالار خاں کے ساتھ سندھ پر حملہ آور ھوا۔

جنگ سے پہلے علاءالدین خلجی نے یہ شرط رکھی تھی کہ اگر دودو نے اپنی بہن بھاگی کو اسکے نکاح میں دیا اور چنیسر کو اپنا جانشین بنایا تو وہ حملہ نہیں کرے گا۔ دودو نے یہ شرط ماننے سے انکار کردیا اور لڑتا ھوا مارا گیا۔

کردار

(جس ترتیب سے اسٹیج پر آتے ہیں)

چھولی ــ دودو کی کنیز
چنیسر ــ دودو کا بھائی
سالارخاں ــ علاءالدین خلجی کا سپہ سالار
دودو ــ سندھ کا حکمراں
بھاگی ــ دودو کی بہن

ایکٹ اول

(خیمے میں شمعدان جل رہا ہے۔ چنیسر شراب پی رہا ہے اور چنیسر کی محبوبہ چھولی کمہارن ناچتے ہوئے گا رہی ہے)

چھولی:-

پی لے، پی لے، جی لے، جی لے
چھن چھن چھن چھن
کالی رین، دیپ شرمیلے
چھن چھن چھن چھن
ٹم ٹم کرتے، بجھتے دیولے
چھن چھن چھن چھن
چھن چھن، چھن چھن، چھن چھن
چھن چھن چھن چھن
چھن .... چھن .... چھن ....

چنیسر:- (خمار میں)

ہر اک شئے آنی جانی ہے
یہاں ہے جو کچھ، سب فانی ہے
جو کچھ بھی ہے بس یہ پل ہے
موت اٹل ہے، موت اٹل ہے

موت ہمارا اپنا سایا
کارونجھر ، کینجھر* کی کایا
موت میانی، موت ہے منچھر†
ساون کی راتوں کی جھر جھر
بیساکھی کی بیلا ہے یہ
انت سمے کا ریلا ہے یہ
سنگ ہمارے ہی جنمی ہے
انجانے میں آ جاتی ہے
انجانے میں اس کو جانا
موت نے کس کا کہنا مانا
اس دھرتی پر کتنے آئیں
جو دھرتی کو ناچ نچائیں
باقی ان کا نام نہیں ہے
نام تو چھوڑو دھام نہیں ہے
پردیسی کا کون ٹھکانا
سب کو مٹی میں مل جانا
دیتی کسے دیا کی بھکشا
موت کے آگے کس کی رکھشا

---

* کینجھر — ٹھٹھہ کے قریب ایک جگہ جہاں نوری اور تماچی کا معاشقہ واقع ہوا

† منچھر — دادو کی ایک جھیل

سچ کو اسچ* بنا دیتی ہے
نگ سی موت دمک دیتی ہے
جس کی نوک چبھی جیون میں
ہر چھاتی میں، ہر دھڑکن میں
کیا ایسا بھی نر ہے کوئی
اتنا زورآور ہے کوئی
موت سے جو آزاد ہوا ہے؟
انساں انساں اک باجا ہے
جس کے سُر میں موت بھری ہے
ہر سینے پر مونگ دلی ہے
جب ہم سب کو مرنا ٹھہرا
جگ سے ہمیں گزرنا ٹھہرا
پھر یہ سب پاکھنڈ اکارت
سارا گھنڈ گھمنڈ اکارت
جھوٹا ہر کایا کا آپا
کانا ہر مایا کا ماپا
دھیر بندھے کیا دھیر بندھائے
ناس کرے کیا ناس کرائے
انساں کا ایمان بھی مٹی
آن بھی مٹی، شان بھی مٹی

---

* اسچ — سندھی میں جھوٹ کو کہتے ہیں

نیر دوشی جس اور چلا ہے
وہی ٹھکانہ دوشی کا ہے
کیوں کہ ہر اک کو مرنا ہے
پیٹ اس ڈائن کا بھرنا ہے

(چھولی کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے صراحی سے پیالہ بھرتا ہے)

جیسا بھی ہے جھوٹا سچا
مرے مُنی سے کتّا اچھا
میں مر جاؤں پھر کیا جانوں
بھور بھی ہو گی کیسے مانوں
جو کچھ ہے، یہ بیداری ہے
روشن رینا اندھیاری ہے
بیلے کی مہکار ہے کیسی
شہد کی میٹھی دھار ہے کیسی
تیرے ڈالی جیسے تن میں
ساری رات اندھیرے بن میں
کویل کی کوکار بھلی ہے
اور وہ سندر نار بھلی ہے
ہمیں جو اپنے پھل دیتی ہے
چار رسیلے پل دیتی ہے
تاڑی ڈول کھجور کے بن میں
جھول جھولے بھیگے ساون میں

رچ جاتا ہے ایسے رس میں
آگ لگاتا ہے نس نس میں
جب نک ٹوٹے تیرا مٹکا
چوس چوس سب رس جیون کا
انت اندھیرا موت کی کارن
اک مٹھی بھر ھاڑ ہے جیون

چھولی:-

اے سائیں! میں ایک کمہارن
گیان دھیان جانے نہ مرا من
لیکن میں نے یہ دیکھا ہے
جیسا ہو جیون پیارا ہے
آوے میں برتن پکتے ہیں
کیسے چتر ابھر آتے ہیں
کچے بھی کچھ رہ جاتے ہیں
تھوڑی چوٹ سے ڈھے جاتے ہیں
پر جو بالکل پک نکلا ہے
اس کا بھاگ کہاں پٹا ہے
میں نے دیکھے گھڑے نکورے
سر سے گرے اور بھورے بھورے
پر جب سر پر لئے گھڑولی
گن گن گائے الھڑ بھولی

لگتی ہے تب کتنی پیاری
کیا ہے یہ مٹی کی پیالی!
پر جب اس میں بھری ہو مدرا
ٹھنڈ ٹھار میں دھری ہو مدرا
تب جو پچھلے پہر اٹھا ہے
ہنس کر رس کا گھونٹ بھرا ہے
اس کی عمر سوارت سمجھو
مٹی یوں تو اکارت سمجھو
مدھ میں ہی معنیٰ ہے سائیں
ورنہ مٹی کیا ہے سائیں

(گاتی ہے)

رہتی ہے مہکار سدا
پھول تو ہر دن مرجھاتے ہیں

خوشبو بن کر تو بھی بکھر جا
ڈرنے والے، ڈر کیسا!
پھول تو ہر دن مرجھاتے ہیں

آ بن بن میں باس رچا دیں
آ رے بھولے! مان کہا
پھول تو ہر دن مرجھاتے ہیں

چنیسر:- (قہقہہ لگا کر)

ہاہا ہاہا، ہاہا ہاہا!
اوھو اوھو، آہا آہا!

پھول تو ہر دن سرجھاتے ہیں
ہر سب کے من کو بھاتے ہیں
عورت بھی تو اک جادو ہے
پورنما میں اک خوشبو ہے
خوشبو پر آتا ہے بھنورا
ہر بھنورا رس لوبھی ٹھہرا
نار کھتوری * کی ڈبیا ہے
اس کو کھول کے جو بھی بانٹے
اس کی خوشبو پھیلاتا ہے
سب کے من کو گرماتا ہے

(سالار خاں کی طرف دیکھہ کر)

پگلی میرا راج یہی ہے
تخت یہی ہے تاج یہی ہے
هاتھہ یہی ، هتھیار یہی ہے
ہر بیری پر وار یہی ہے
میں اور اس سے تجھے چھپاؤں
ایسا بھی نادان نہیں ہوں
کلی بھنور سے گھبراتی ہے
جا جاہ یوں کیوں شرماتی ہے؟



---

* کھتوری ــ (کستوری) مشک

دوسرا ایکٹ

(پہلا پردہ)

(آدھی رات کا وقت ہے۔ دودا سومرا اپنی بہن بھاگی کے ساتھ بیٹھا ہے اور خیمے کے باہر تاریکی میں آسمان کی طرف دیکھ رہا ہے)

دودو:-

کیوں آج چاندنی کا رستا
اندھیارے نے یوں روک لیا
گھنگھور گھٹا کا گھیرا ہے
ہر شور ہوا کا پھیرا ہے
گھپ گھوں گھوں، گھوں گھوں ہے کرتی
لگتا ہے قناتیں خیمے کی
اس سارے تنبو کو ڈھا کے
اڑ جائیں گی اس جھکڑ سے
یوں تو ہر شے ڈول رہی ہے
پر اک چیز اڈول رہی ہے
یہ جو اک انسان کا دل ہے
یہ ہر مشکل کی مشکل ہے
دیکھو تو ایسا کومل ہے
جیسے جل میں نیل کمل ہے

ہر جب اپنی پر آجائے
دھرتی اور گگن تھرائے
تارے اس کے لئے جھکے ہیں
پربت سجدے میں گرتے ہیں

(بھاگی کی طرف دیکھ کر)

خاجی تیرا رشتہ مانگے
تا کہ تخت چنیسر کو دے

بھاگی:-

تاج بھی کیا ہے؟ تخت بھی کیا ہے؟
سونا روپا بخت بھی کیا ہے؟
جو کچھ بھی ہے سب مایا ہے!
انساں تو ننگا آیا ہے!
ننگے ہی ہے لوٹ کے جانا
لیکن تم یہ نہیں بھلانا
تیرا تخت ہے ایک امانت
سارا بخت ہے ایک امانت
یوں دھرتی پر راجہ کتنے
لیکن جنتا خوش ہے تجھ سے
دودھ دھی ہر ڈیرے میں ہے
ہریالی ہر ڈیرے میں ہے

سانجھ سمے میلے سجتے ہیں
گلی گلی ڈھیلے بجتے ہیں
سینچ کے اپنی کھیتی باڑی
شام پڑے جب سارے لاڑی *
پہنے اجرک † پھولوں والا
گاتے ہیں تٹ تٹ پر آلا
ہر دکھ دور بھگا دیتے ہیں
سکھ کی نیند ابھی سوتے ہیں
اپنا تاج اگر چھوڑو گے
اس دھارے کا رخ موڑو گے
یہاں پرائے پیر دھریں گے
دھرتی کو سنسان کریں گے
ایک دراڑ اگر پڑ جائے
گھسے گی ناگن پھن پھیلائے
پودوں میں تیتر کے بچے
نگل جائے گی ڈائن کچے
تونے ناگ اگر ہے دیکھا
دیکھا ہوگا اس کا لپکا
جب تک مٹی پر رہتا ہے
جیو جیو اس سے بچتا ہے

---

* لاڑی ــ سندھ کے جنوبی علاقے لاڑ کے باشندے
† اجرک ــ سندھ کی ایک سوتی شال

(دودے کی چھاتی پر ہاتھہ رکھکر)

جو انساں جگ میں جیتا ہے
اس میں اس کا باپ چھپا ہے
دادا، پر دادا، تر دادا،
ہر پھر اس کے آگے آتا
نانا، پر نانا، تر نانا
اس سے نہیں کوئی بیگانا
بزدل اگر چھپا ہو اندر
وار کرے گا اپنوں ہی پر
ابھر کے جب باہر آجائے
انساں کی شکتی کھا جائے
رال کا پتلا انساں کیا ہے؟
پیڑھی کا اک پرچھاواں ہے
گر تو دیس پہ وارا جائے
لڑتے لڑتے مارا جائے
دودا، اپنی جان تو دے گا
لوگوں کو ایمان تو دے گا
تیرا بیٹا، تیرا پوتا
جن کے بیج آج تو بوتا
آزادی کے لئے بڑھیں گے
بڑھتے بڑھتے آن لڑیں گے

ان کے لئے مثال چھوڑ جا
یا پھر ایک سوال چھوڑ جا
مرے لئے تو جو بھی قبولے
خلجی، کتا، جو بھی قبولے

دودو:-

تیرا میرا خون ایک ہے
سارا جوش جنون ایک ہے
یہ جو پیاری بات کہی ہے
میرے دل کی بات کہی ہے
منش نہیں ماٹی کا لوندا
نا وہ گونگا نہ وہ بہرا
یوں تو سارا راز بھی وہ ہے
لیکن اک آواز بھی وہ ہے
موت تو بس اک پرچھائیں ہے
ماس کا مٹنا کچھ بھی نہیں ہے
لیکن کوئی شے رہتی ہے
جیون میں جو چمک رہی ہے
جیون مرن کا تت* ہوتی ہے
جو شکتی اور ست ہوتی ہے
بھاگی! گر میں مارا جاؤں
اس دھرتی پر وارا جاؤں

* تت ــ نچوڑ

سچ کہتی ہے، جان تو دوں گا
لوگوں کو ایمان تو دوں گا

(دوسری طرف سے چھولی دوڑتی ہوئی آتی ہے اور دودے کے پیروں میں گر کر سسکیاں بھرتے ہوئے کہتی ہے)

چھولی:-

میرے دیس کے راج دلارے
او سائیں! او جگ جگ پیارے
سُر سپنا ہو، جب میں گاؤں
تانوں میں سنسار سماؤں
سُر کی نیلی سندرتا میں
پیڑھی پیڑھی کی پیڑا میں
چین کی گھڑیاں لا سکتی ہوں
سکھ کی لہر اٹھا سکتی ہوں
میں گھنگھرو کی چھم چھم چھم ہوں
جب اس دھرتی پر میں ناچوں
چھن چھن ہوں تاروں کے سکّے
کیا تھے وہ سونے کے سکّے
جن پر اپنے آپ کو بیچا!
مورکھ تھی اس تھاپ کو بیچا
جس پر چندا ناچ اٹھا تھا
گگن ھمک کر جھک آتا تھا

میرا کوئی مول نہیں ہے
ہاں گر کوئی مجھکو چاہے
اپنی اوک کنول سے لائے
موتی چھوڑے مجھکو پائے
شبنم کے آگے موتی کیا!
بھیگی آنکھوں کی بولی کیا!
میں نے اپنی قدر نہ جانی
رہی چنیسر کی دیوانی
کس چھل کے پھندے میں آئی
کس بزدل سے پیت لگائی
آج جو یوں بے حال کھڑی ہوں
اک مسلی دسلی بگیا ہوں
پھول آجاڑے گئے ہیں جس کے
پات اکھاڑے گئے ہین جس کے
کارن میری ہی نادانی
اپنی قدر نہیں پہچانی
دھول چنیسر سارا دھوکا
سونہاری * میں سانپ پلا تھا
جھوٹ بھلا کیا کاج کریگا
راج سدا تاراج کریگا

* سونہاری ــ لاڑ کی ایک جھیل کا نام

جو دلدل میں پیر دھرے گا
کیچ میں لت مت موت مرے گا
نگل ہی جائے دلدل گہری
دودا سائیں! تیرے بیری
رات کریں گے تجھ پر حملہ
باندھ رکھے ہیں یہ منصوبہ

دودو :-

لاج سے اچھی کون چنریا!
ہاتھ جھوٹ کا جس نے چھوڑا
اپنی راہوں کا رخ موڑا
پھر اس کو پچھتاوا کیسا!
ناری سچ ہے دھوبی ایسا
اجلا کر دے جیون لتّا
من من کا یوں میل اتارے
دھودے پاپ پرانے سارے
جھوٹ سے جب بھی جان چھڑائی
رگ رگ رسّی بن لہرائی
کھینچ لیا کھائی سے باہر
سچ ہے سچ بن دھول برابر
انسانوں کا رہنا سہنا
جو دکھ تجھے پڑا ہے سہنا

کلا تری اجلا جائے گا
تجھ میں دیا جلا جائے گا

(بھاگی سے)

جھوٹا بزدل کا ہر سنگی
حاجت جب بنتی بھک منگی
جھوٹ بھرے تب اس کی پیالی
اور جب لوٹے مانگنے والی
پیچھے چھپ کر ہنسی آڑائے
اس چادر کا چھید دکھائے
جو اس نے منہہ پر اوڑھی ہے
جھوٹ کوئی روگی کوڑھی ہے
جس نے اسے چھوا پچھتایا
بھیک میں پایا کوڑھ پرایا
جو بھی کہے چنیسر اس دم
جانچ چکا ہوں اس کا دم خم
جس کی ڈور پرائے بس ہے
ناچے گا، کتنا بے بس ہے
ڈور بلندی پر لے جائے
یا اس سے مٹی چٹوائے
ڈور بگاڑے ڈور بنائے
ڈور نکیلوں ناچ نچائے

چھولی :-

بزدل کی ہر سوچ بھی جھوٹی
لوبھ بھی جھوٹا، کھوج بھی جھوٹی
پسو* کی موت جسے ہو مرنی
کیا سمجھے کرنی کی بھرنی
وہ سمجھا ہے ماس ہے جیون
مانس کا بس احساس ہے جیون
اس کے من میں موت کی کیچڑ
پسو کے کان میں جیسے چیچڑ

دودو :-

موت تو سب کی ہی بیرن ہے
ہر چوکھٹ ہے، ہر آنگن ہے
تاڑے چوکھی گھات شکاری
پھر بھی دیکھ، پکھیرو ڈاری
اڑتی ہے پر پھیلاتی ہے
سورج اور بڑھی جاتی ہے
یہ چنتا کب انہیں ستائے
کس کی باری کب آجائے
پھر انساں میں یہ ڈر کیسا
موت تو ہے بس ایک جھپاکا

* پسو — جانور

اور پھر کیا ہے؟ انجانا ہے
مر کر یہ کس نے جانا ہے
ہے ہے میں اب نہیں ہوں جیتا
سنگ سمے کے میں بھی بیتا
موت اک خوف اکارت کا ہے
سمے سدا رہنے والا ہے
مرے گا کیا جو جی نہیں پایا
اجڑے گھر کیا چور کا کھٹکا
موت اندھیری کرے اشارا
جیون نہیں گگن اندھیارا
اس میں تارے ٹم ٹم کرتے
روشنیوں کی رم جھم کرتے
جُگ جُگ جی! جھلمل ہے جیون
جھرنے کی کِل کِل ہے جیون
جس پر بہتے دیپ ہزاروں
من ساگر میں سیپ ہزاروں
دھرتی کے سچے میانوں کے
ساونتوں کے بلوانوں کے
سمے میں جیون جوتی پلتی
مجھ تک پہنچی جلتی جلتی
اور میرے بھی بعد جلے گی
ہر پیڑھی کے سنگ چلے گی

جیون جوت نہیں مرنی ہے
جو کچھہ آج مری کرنی ہے
اس کا بیج اگا جاؤں گا
اپنی جوت جلا جاؤں گا

(دوسرا پردہ)

(دودو کے حکم پر جنگ کا نقارہ بجتا ہے اور سب جنگی جوان ہتھیار باندھے تیار ہوتے ہیں۔ آسمان سے گھٹا ہٹ گئی ہے۔ صاف چاندنی میں چھاؤنی نظر آ رہی ہے)

دودو:-

ساونت سنور کر نکل رہے
بلونت بپھر کر نکل رہے
یہ جتھے نڈر نڈر
آتے سر دھرے ہتھیلی پر
بڑھ بڑھ کے سومرے* آتے ہیں
کیا دھرتی کو تھرّاتے ہیں
او اپنے دیس کے رکھوالو
تم رن میں پیر جو آج رکھو
پُرکھوں کی لاج نبھا ڈالو
ان ساونتوں کو یاد کرو

* سومرے — دودو کی قوم کا نام

اس دیس میں جن سا ویر نہیں
اس سمے ندی میں نیر نہیں
ارموش* اڑاتے چل نکلو
دوڑاتے نیش† چلو رن کو
آشیرباد ان پرکھوں کی
ہو جیسے بڑ کی چھاؤں گھنی
جو پیٹھ پہ وار نہ لیتے تھے
ڈھالوں پہ کٹار نہ لیتے تھے
غیرت جن کی رگ رگ میں ہے
وہ سیس جھکانے سے پہلے
کٹواسکتے ہیں اپنا سر
تب تک ہر وار ہے چھاتی پر
جب تک پی جام شہادت کا
سندھڑی کو انت کریں سجدہ



---

* ارموش ــ آٹھ سال کا اونٹ
† نیش ــ ارموش سے کم عمر اونٹ

تیسرا ایکٹ

(پہلا پردہ)

(دودو فوج کو جوش دلا رہا ھے۔ چھولی خیمے کی اوٹ سے دیکھہ رہی ھے)

چھولی :- (اپنے آپ سے)

دودا تجھ کو چاند لگا تھا
چاند بھی جیسے ماند لگا تھا

تونے سوچا میں چھولی ھوں
کیسے اسے ابھر کر چھولوں

چندا ڈالے ترچھا سایا
درشن دیتا دور سے کیسا

ھاں ! پر کتنی دور بسا ھے
اس کی سنگت ! بس سپنا ھے !

تو کیوں آج کنارے لوٹی
اتھلے جل میں کیا ھے؟ چھولی*

آج جو تو گدلی میلی ھے
گھاٹ اور کیوں لوٹ رہی ھے؟

---

* چھولی ـــ سندھی میں لہر کے معنی میں مستعمل ھے

دودو :- (فوج سے)

کس بات سے ڈرتے ہو لوگو !
ہر دن ہی مرتے ہو لوگو !
ایسے مرنا، ویسے مرنا
پھر اس مرنے سے کیا ڈرنا
ہاں اس کا جیون سپھل رہا
جو سینہ تان گزار گیا
جو کرتا یاری ویروں سے
تلواروں سے اور تیروں سے
جو دھاک بٹھادے رن رن میں
وہ جان گنواتا کارن میں
کیوں وید کے ہاتھوں زہر پیو
کیوں لولے لنگڑے بنے چلو
کیوں سسک سسک کر جانیں دو
اور لڑھک لڑھک کر جانیں دو
ہر روز ہزاروں میں انسان
بے انت قطاروں میں انسان
جاتے ہیں موت کی بانہوں میں
سونی اندھیاری راہوں میں
یہ بھر بھر بھوری مٹی ہے
ہم کیا جانیں کس کس کی ہے

او پوت مہان جیالوں کے
آن اونچی گردن والوں کے
جو ہیٹی آن نہ کرتے تھے
جو گھر میں پیر نہ دھرتے تھے
جب تک نہ مٹادیں بیری کو
یا مار بھگادیں بیری کو
بھومی کا بچاؤ کرنے کو
وہ کھیل سمجھتے مرنے کو
راکاس جنہیں دھلا نہ سکے
وہ پربت! کوئی ھلا نہ سکے
جو رنگ جماتے جنگوں میں
تھا لوھا جن کے انگوں مین
وہ پُرکھے تم میں بستے ھیں
پگڑی پگڑی میں ھنستے ھیں
او سندھ سپوتو! دل والو
بیری کو آج مسل ڈالو
یہ آج نہ تم سے بچ نکلیں
یوں سڑ سڑ سڑ تیر چلیں
جیسے گڑ گڑ برسین اولے
یوں جھپٹو تلواریں تولے
جب بھڑک کے گھوڑے چکرائیں
اور کھا کے پچھاڑ سوار گریں

جب ہنکاروں کا شور مچے
گھمسان کا رن جس وقت پڑے
ہر وقت سنبھل کر وار کرو
سر دھڑ کوئی نہ رہنے دو
یا آج یہ رن سر کرنا ہے
یا لڑتے لڑتے مرنا ہے

چھولی :- (اپنے آپ سے)

یہ لہو بھگوئی آزادی
انسان میں بوئی آزادی
ہیٹے کا مان بڑھاتی ہے
نربل کو ویر بناتی ہے
تدبیر کو یہ تقدیر کرے
تقدیر کو یہ تدبیر کرے
کیا پیڑا کو گرماتی ہے
شیروں سی راڑ مچاتی ہے
اور پھر چھڑا کر کڑیوں سے
جیسے دوجا جیون دے دے
اے دودا ! میں قربان گئی
ساری چنتا اس آن گئی

(چھولی خیمے سے تیر بھرے ترکش اوز کمان لیے باھر آتی ھے۔ ترکش کندھے پر لٹکاتی ھے تو دور سے گرد و غبار اڑتا ھوا نظر آتا ھے اور گھوڑوں کے سموں کی آواز آتی ھے۔ پردہ گرتا ھے)

(دوسرا پردہ)

[جھٹ پٹے کا وقت ہے۔ دودو کے اکثر سپاہی مارے گئے ہیں۔ باقی فوج تتر بتر ہو گئی ہے۔ میدان جنگ میں ہزاروں لاشیں پڑی ہیں اور ان کے بیچ میں دودو زمین پر گرا ہوا ہے اور چھولی کو اداس آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ چھولی کے ایک ہاتھ میں مشعل ہے اور دوسرے ہاتھ سے دودو کے منہ میں مشکیزے سے پانی ڈال رہی ہے اور سسکیاں بھر رہی ہے]

دودو:-

ڈھلتی بیلا بھی آ پہنچی
اب ہے موت فقط اک ہچکی
گھاٹ پہ جیسے رسّی چھوڑی
لے ہچکولا، نیّا دوڑی
گہرے کا اسرار نہ جانے
آر نہ جانے پار نہ جانے

(چنیسر میدان جنگ میں لاشیں دیکھتا ہوا دودو کے پاس آتا ہے)

چنیسر:-

کاہے اتنی اکڑ دکھائی
دودا، یوں کیوں جان گنوائی
مات مانتے، عیش اڑاتے
یوں نہ جوانی میں مرجاتے

دودو:-

کچھ کہہ لے، میں نہیں مروں گا
بھیس بدل کر پھر لوٹوں گا
تو بھی چنیسر، جو کچھ چاہے
لوٹے گا مجھ سے بھی پہلے
نام نئے سے بھیس بدل کے
تیری میری جنگ ازل سے
جاری ہے اور رہے گی جاری
جاری . . . ہے اور . . . رہے گی . . . جاری . . . !

(دودو مرجاتا ہے۔ چھولی آنسو پونچھتی ہے اور گاتی ہے)

چھولی:-

روز پتنگے جل جاتے ہیں
دیکھ دیئے کی لاٹ وہی ہے
ایک بجھے تو دوجے دِیپک
روز جھروکے جھمکاتے ہیں
دیکھ دیئے کی لاٹ وہی ہے
کچھ دل والے ویرانوں میں
ہنس کر لہو کھلا جاتے ہیں
دیکھ دیئے کی لاٹ وہی ہے

(آہستہ آہستہ پردہ گرتا ہے)

٭

شیخ ایاز

(شخص اور شاعر)

حمایت علی شاعر

اے دھوپ کے بالوں والی اگنی۔ اے میری کویتا۔
کیا آج تک کسی نے تیرے مکھڑے سے لٹیں ہٹا کر
تجھے دیکھا ہے؟

شیخ ایاز

پاکستان آتے ہوئے جب میں نے سندھ کی سرحد پر قدم رکھا تو میرے دل میں دو آرزوئیں تھیں:

حیدرآباد کو دیکھوں

شیخ ایاز سے ملوں

حیدرآباد کو دیکھنے کی آرزو تو ظاہر ہے کہ میری مٹی کا تقاضہ تھا لیکن شیخ ایاز سے ملنے کی آرزو ایک ایسے لمحے کا اشتیاق تھا جو ایک خاص جذبے کے زیر اثر ترقی پسند مصنفین کانفرنس (بھیمڑی) کے ایک اجلاس میں ایک والہانہ کیفیت کے ساتھ میرے دل میں بیدار ہوا اور اُس وقت تک مضطرب رہا جب تک میں نے شیخ ایاز کو بہت قریب سے دیکھ نہ لیا۔

یہ سنہ ۱۹۴۹ع کی بات ہے۔ حیدرآباد دکن میں تلنگانہ تحریک اپنے شباب پر تھی۔ دکن کا آتش نوا شاعر مخدوم اپنے جیالے ساتھیوں کے ساتھ لہلہاتے کھیتوں سے آواز دے رہا تھا:

دیارِ ہند کا وہ راہبر تلنگانہ

بُلا رہا ہے بہ سمتِ دگر تلنگانہ

اور ہم ہرے بھرے نوجوان اُسکی آواز کی گونج اپنی رگوں میں محسوس کر رہے تھے۔ پاک و ہند کے تمام انسانیت دوست ادیب و شاعر شعلۂ جوالا بنے ہوئے تھے۔ ہر لفظ سنسناتی ہوئی گولی کی طرح دہنِ قلم سے نکل رہا تھا اور انسانیت دشمن طاقتوں کے مورچوں پر برس رہا تھا۔

دراصل ان دنوں برطانوی سامراج کے خلاف برصغیر کی اجتماعی جنگ کے هراول دستے نے اپنا رخ اس طرف موڑ لیا تھا جدھر سامراج کے جانشین اپنی کمین گاهیں بنائے بیٹھے تھے اور اجتماعی آزادی کے خوبصورت نام کے پردے میں اپنے مکروہ چہرے چھپائے طبقاتی استحصال کی راهیں هموار کر رهے تھے۔

انسانیت پسند ادیب، شاعر اور فن کار اس حقیقت کو بہت پہلے سے سمجھ رهے تھے چنانچہ برصغیر کی تمام زبانوں کے لکھنے والے هم آواز هو کر ایک هی صف میں آ گئے اور بمبئی کی میونسپل حدود میں جب کانفرنس کی اجازت نہ ملی تو قریب هی ایک گاؤں "بھیمڑی" میں جمع هو گئے۔ اس کانفرنس میں هر زبان، هر علاقے اور تقریباً هر مذهب کا نمائندہ قلم کار موجود تھا اور ادبی روداد کے پس منظر میں وہ سماجی اور سیاسی حقیقتیں سامنے آرهی تھیں جنھوں نے هر باضمیر انسان کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔

ظلم کہیں بھی هو — کرب کی کیفیت ایک هی هوتی هے۔ چنانچہ آندھرا کے مشہور ادیب اور "مابھومی" ناٹک کے خالق بھاسکر راؤ نے جب تلنگو ادب اور تلنگانے میں کانگریس حکومت کے مظالم کے بارے میں اپنی روداد سنائی تو ایک سندھی ادیب چیخ پڑا — اس نے سندھی میں کوئی شعر پڑھا جسے شائد هی کسی نے سمجھا هو مگر اس کے چہرے پر غم و غصہ کا جو اضطراب ٹھہر گیا تھا، اس نے زبان کی حدیں توڑ کر هر دل میں ایک هیجان برپا کر دیا۔

اس ادیب کا نام رام پنجوانی تھا۔

اجلاس کے اختتام پر اس نے بتایا کہ یہ شعر سندھ کے شعلہ نوا شاعر شیخ ایاز کا ہے، اور پھر اس نے شیخ ایاز کے بارے میں ایسے پیار سے ہر بات بتائی، گویا وہ اپنے کسی محبوب کا ذکر کر رہا ہو۔ اس نے بتایا کہ اس کے گیت سندھ کے گاؤں گاؤں میں گائے جاتے ہیں۔ ہماری فرمائش پر اس نے شیخ ایاز کے سندھی اشعار بھی سنائے اور ان کا مطلب بھی سمجھایا۔ دوران گفتگو میں سندھ اور سندھی زبان کے دوسرے ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں بھی معلومات حاصل ہوئیں اور وہ دیر تک بڑے دکھ اور حسرت سے ایک ایک دوست اور ایک ایک گلی کوچے کو یاد کرتا رہا۔

شیخ ایاز سے یہ میرا پہلا غائبانہ تعارف تھا۔ ان دنوں میں نے پاکستان آنے کے بارے میں سوچا بھی نہ تھا، اسی لئے یہ محفل ایک خوشگوار یاد بن کر میرے دل میں رہ گئی۔

پاکستان آنے کے بعد حیدرآباد کو تو میں نے دیکھ لیا بلکہ بعد ازاں یہیں سکونت اختیار کرلی لیکن شیخ ایاز سے سنہ ۱۹۵۳ء میں پہلی بار ملاقات ہوئی۔ یوں ہوا کہ سکھر میں سندھی اردو ادبی کانفرنس منعقد ہوئی، پاکستان کے سبھی نامور ادیب اور شاعر ایک دوسرے سے متعارف ہوئے، ایک اجلاس غالباً شیخ ایاز کی صدارت میں بھی ہوا۔

میں نے پہلے اسے دور سے دیکھا ــــ اور وہ مجھے ویسا نظر نہیں آیا جیسا اپنے اشعار میں تھا۔ یہی احساس مجھے پہلی بار فیض صاحب کو دیکھ کر بھی ہوا تھا۔ لیکن فیض صاحب میں اور مجھ میں عمر کا اتنا فرق تھا کہ میں نے اپنے تاثر کا سارا

الزام عمر کے تفاوت پر ڈالدیا تھا مگر ـــ شیخ ایاز۔ ۔ ۔ ۔!

میں نے سوچا، آدمی صرف تصور ھی کا نام ھے۔ کاش آدمی حقیقت نہ ھوتا۔ لیکن جب شام ڈھلی اور ریگزار سندھ کی نرم و خنک ھوا، چاند کی مینا اٹھائے ھماری محفل میں آئی اور روپہلی کرنوں کی پھوار میں شاعرِی کی دیوی نے اپنا گھونگھٹ الٹا تو محفل کا رنگ ھی اور تھا۔

جگر مرادآبادی اور مخدوم محی‌الدین کو جن لوگوں نے سنا ھے ـــ جانتے ھیں کہ جب وہ شعر سناتے تھے تو یوں محسوس ھوتا تھا کہ زندگی کا سارا حسن سمٹ کر ان کی ذات میں آگیا ھے۔ ممکن ھے اس کیفیت میں ان کے اشعار کے ساتھ ان کے ترنم کا بھی جادو ھو۔ مگر فیض صاحب جس انداز میں شعر سناتے ھیں ـــ سمجھ میں نہیں آتا کہ شاعری کی دیوی کو، اسکے باوجود ان پر کیوں اتنا پیار آتا ھے۔ ایسا لگتا ھے کہ عشق اندھا ھی نہیں بہرہ بھی ھوتا ھے۔ ورنہ شاعرِی کی دیوی کو تو ان سے روٹھ کر ھمیشہ کے لئے چلے جانا چاھئے تھا۔

اس رات فیض صاحب تو محفل میں نہیں تھے البتہ شیخ ایاز نے ان کی جگہ لے رکھی تھی اور اپنے مخصوص انداز میں شعر اس طرح سنا رھا تھا گویا پتھر پھوڑ رہے جا رھے ھوں ـــ لیکن رفتہ رفتہ لہجے کا کُھردُراپن اشعار کی طلسمی فضا میں کہیں گم ھوگیا اور وہ غنائی کیفیت ابھر آئی جو غالِب کے الفاظ میں "فردوس گوش" ھوتی ھے۔

کھلتا پھول کنول کا
ننھا بچہ

ماں کی چھاتی سے لپٹا ہے
پھول پہ پھول کھلا ہے



تڑپتی ہوئی بجلیوں کی طرح
معنی حسن کاشانۂ قلب پر آگرے
اور میں ایک سہما سا پنچھی
اسے دیکھتا رہ گیا



آرزوؤں کے پھول چن لینا
قصہ ہائے بہار سن لینا
اور مہکتی ہوئی فضاؤں میں
سنتے سنتے مدام، سوجانا
ہے یہی اختتام، سوجانا



اتنی فرصت ہو مجھے
بادلوں میں چاند کو دیکھا کروں
موجۂ آب رواں پہ لالہ و گل کے ٹہلتے عکس کا پیچھا کروں
خلوتِ شام خزاں میں بیٹھ کر سوچا کروں



میں نے انسان کے دل میں جھانکا
ایک چھوٹا سا کنواں
جس میں عکس مہ و انجم کے سوا کچھ بھی نہ تھا
میں نے چلّو میں لیا کچھ پانی
اور بلائیں دو جہاں کی نظر آئیں مجھ کو



شیخ ایاز اپنا اردو کلام سنائے جا رہا تھا۔ اور میں سوچ رہا تھا کہ ایک سندھی زبان کا شاعر اردو میں اتنی اچھی شاعری کیسے کرلیتا ہے! محفل ختم ہوئی تو دیر تک اس کا ایک مصرعہ میرے ذہن میں گونجتا رہ گیا جو شاید اسکی پوری شخصیت کا آئینہ دار تھا:

بادلوں کی تہوں میں بھٹکتا ہوا ایک حیرت زدہ شوقِ وارفتہ ہوں

اس رات شیخ ایاز مجھے حقیقت اور تصور کے اس سنگم پر ملا جہاں ظاہر و باطن کی دوئی ختم ہوجاتی ہے۔ وہ مجھے ایک مکمل اکائی کی شکل میں نظر آیا۔ شاعر اور صرف شاعر ــ اور میں نے سوچا۔ حقیقت کتنی حسین ہوتی ہے، آدمی تصور سے زیادہ حقیقت میں خوبصورت ہوتا ہے، فیض اور شیخ ایاز۔ دونوں خوبصورت انسان ہیں۔ ایک میرا پیش رو ہے، ایک میرا ہم عصر۔ دو عہد آگے پیچھے ہیں لیکن دونوں ایک ہی آئینے کے "ترمرے"* ہیں۔ شاعری، ڈرامائی لب و لہجے کی محتاج ہے نہ مترنم آواز کی ــ وہ تو خود ایک گنگناتی ہوئی روح ہے جو دل سے دل میں سفر کرتی ہے، ایک ملکوتی نشہ ہے جو سارے وجود کو سرشار کر جاتا ہے۔

اس ملاقات کے بعد میں شیخ ایاز کو قریب تر محسوس کرنے لگا۔ سندھی زبان سے ناواقفیت کے باوجود میں اس کو جانتا گیا۔ پہچانتا گیا۔ اور مجھے معلوم ہوا کہ اردو اور سندھی کا سنگم۔ جس کا دوسرا نام شیخ ایاز ہے، کن دریاؤں کے اتصال سے عبارت ہے، اس کے گھر میں اردو نے کیسے راہ پائی اور اسکی زبان پر آکر کسطرح شاعرانہ احساس کا ذریعۂ اظہار بن گئی۔

---

* آئینے سے منعکس ہونے والی سورج کی روشنی۔

شیخ ایاز کے دادا شیخ بنگل حکیم تھے اور میونسپل کونسلر بھی۔ ان کی عمر کا کافی حصہ دھلی میں حکمائے وقت کی صحبت میں گذرا۔ انھوں نے میرٹھ میں شادی کی اور اسطرح دو زبانوں اور دو تہذیبوں نے ایک اکائی کی بنیاد رکھی۔ شیخ ایاز کے والد ماجد شیخ غلام حسین فارسی اور اردو، دونوں زبانوں کے ماھر تھے۔ لا ایجنٹ تھے مگر ادبی ذوق بھی رکھتے تھے۔ دیوانِ حافظ کے ایسے شیدائی تھے کہ ھر روز صبح پانچ بجے اٹھ کر پابندی سے پڑھا کرتے۔ شیخ غلام حسین کو سیر و سیاحت کا بھی شوق تھا، ھندوستان کا شاید ھی کوئی شہر ھو جو انھوں نے نہ دیکھا ھو۔ انگریزی کم جاننے کی وجہہ سے اردو میں قانون کی کتابوں کے متلاشی رهتے، بیرسٹر ملاّ سے ملنے جب بھی بمبئی جاتے تو حیدرآباد دکن ضرور جاتے کیوں کہ یہ کتابیں انہیں وهیں مل سکتی تھیں۔ چنانچہ ان کے پاس فارسی کے علاوہ ادب اور قانون پر اردو کتابوں کا بھی بڑا ذخیرہ تھا۔ گھر میں اردو کے وہ تمام رسائل آتے تھے جن میں اعلیٰ ادبی تحریریں چھپتی تھیں مثلاً نگار، همایوں، ادبی دنیا، عالمگیر، نیرنگِ خیال، دین دنیا اور خیام وغیرہ۔

ایاز کو ورثے میں نہ صرف ادب اور قانون ملا، بلکہ وہ مشترک تہذیبی اقدار بھی اس کی تربیت کا حصہ بنیں جو اس خاندان میں ھاتھ سے ھاتھ ملائے ھوئے تھیں۔

شیخ ایاز کی جائے پیدائش شکارپور ھے اور تاریخ ۲۳ مارچ سنہ ۱۹۲۳ع۔ ابتدا سے میٹرک تک تعلیم شکارپور ھی میں حاصل کی۔ اردو تیسری جماعت ھی میں سیکھ لی تھی اور میٹرک پاس کرنے تک ایسی کتابیں بھی پڑھ لی تھیں جو کسی زبان کے

مزاج کو سمجھنے کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔ اشعار پڑھنے کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ ایک دن سوامی رام تیرتھہ کی ترجمہ شدہ ڈائری کے منتخب اشعار نے ایسا اکسایا کہ سندھی میں ایک غزل کہدی۔ ڈرتے جھجھکتے غزل اپنے استاد کھیئل داس فانی کو دکھائی تو سارے شعر موزوں نکلے۔ فانی صاحب نے نہ صرف تعریف کی بلکہ حوصلہ بھی بڑھایا۔ اس وقت شیخ ایاز کی عمر گیارہ سال تھی۔ ایاز نے ابتدائی چند سال اپنی شاعری پر فانی صاحب ہی سے اصلاح لی اور انہیں کی ہدایت پر حاجی محمود خادم کی عروض پر لکھی ہوئی کتاب کو اپنے دوسرے استاد مولوی عبدالغفور سے باضابطہ پڑھا۔

اسی دور کا ایک دلچسپ واقعہ بھی ایک دن شیخ ایاز نے مجھے سنایا:

"بارہ تیرہ سال کی عمر ہی سے میرا کلام رسائل میں چھپنے لگا تھا۔ ابتدا میں "سدرشن" (شکارپور) میں نظمیں شائع ہوئیں پھر "سندھو" (میاں گوٹھہ) میں — جو اس دور میں سندھ کا ایک معیاری ادبی رسالہ تھا۔

ایک شام "سندھو" کے ایڈیٹر راجپال مجھہ سے ملنے آئے۔ آواز دی، میں گھر سے باہر نکلا اور بتایا کہ میں ہی ایاز ہوں تو انہیں یقین نہیں آیا۔ جب میں نے یقین دلایا تو یہ کہہ کر واپس چلے گئے کہ اتنا چھوٹا سا لڑکا ایسی نظمیں کیسے لکھہ سکتا ہے۔ اسکے بعد انہوں نے میری کوئی نظم دو سال تک اپنے رسالے میں شایع نہیں کی۔"

اسی عمر میں ایاز کی زندگی میں ایک بڑا سانحہ بھی

پیش آیا ۔ اسکے والد کا سایہ اس کے سر سے اٹھ گیا۔ اس سانحے نے اسکی ذات میں ایسا خلا پیدا کردیا کہ وہ اپنے آپ کو اندھیرے میں لڑھکتا ہوا محسوس کرنے لگا ۔ صرف ایک بے سہارا ماں کی آغوش تھی جس میں اسکو آخری پناہ ملی ۔ مگر اس آغوش میں بھی غم زدہ مامتا کے سوا کچھ نہ تھا۔ آنسو تھے اور زندگی کا تپتا ہوا وسیع صحرا ــ کون جانے کہ صحرا کے اس سفر میں اسکے پیروں میں کتنے آبلے پڑ گئے ، کتنے بگولے اٹھے اور اپنی گردشوں میں لپیٹ کر اسے ریزہ ریزہ کر گئے ۔ آنکھوں میں کتنے خواب اترے جو دامنِ نگاہ پر سراب کی طرح چمکے اور خشک ریت کے تودوں میں ڈھل گئے ۔

ایسے عالم میں شیخ واجد علی تھے (شیخ ایاز کے ماموں خسر) جنھوں نے شکستہ دل ایاز کے سر پر ھاتھ رکھا اور اسکے ٹوٹے پھوٹے وجود کو کسی حد تک جوڑنے کی کوشش کی۔ وہ علی گڑھ کے تعلیم یافتہ تھے اور ادبی ذوق بھی رکھتے تھے۔ لیکن وہ دراڑیں جو شیخ ایاز کی کچّی شخصیت میں پڑ چکی تھیں ، اور محرومی کا وہ کربناک احساس جو اسکی رگِ جاں میں اتر چکا تھا، بھری دنیا میں اسے ایسی تنہائی دے گیا جو آج بھی اسکی ذات میں پھیلی ہوئی نظر آتی ھے۔

نوجوانی میں اس نے اس تنہائی کو آباد کرنے کے ھزار جتن کئے ۔ پیکروں سے لیکر پرچھائیوں تک ، تصور سے لیکر حقیقت تک ۔ خلوتوں میں جگمگاتی ہوئی کتنی ھی جلوتیں آئیں۔ مگر جب بھی ھاتھ بڑھے، ہر جلوہ اپنے ھی خیال کا عکس ھوکر رہ گیا۔ یافت و نایافت کے ان مرحلوں میں نہ جانے اسکی روح کتنی بار

زخمی ہوئی اور آنسوؤں میں ڈوبے ہوئے کتنے ہی ایسے درد و غم ملے جو شرمندۂ اظہار بھی نہ ہو سکے۔

شیخ ایاز کا وہ زمانہ جو ایک طرف حصولِ تعلیم کا زمانہ تھا اور دوسری طرف شاعری کا۔ شیشہ و سنگ کی رفاقت کے مترادف تھا۔ ہر چند کہ یہ رفاقت بھی رقابت انگیز تھی مگر شیخ ایاز نے انہیں آپس میں ٹکرانے نہیں دیا بلکہ دونوں کو ساتھ لیکر زندگی کا یہ سفر طے کر لیا۔

اعلیٰ تعلیم کے لئے وہ کراچی میں قیام پذیر تھا لیکن معاشی مسائل اُسے جلد سے جلد تعلیم ختم کرنے پر مجبور کرتے تھے۔ چنانچہ بی۔ اے۔ کے بعد ایم۔ اے۔ کرنے کے بجائے اُس نے لا کالج سے ایل ایل۔ بی۔ کرلیا۔ یہ سنہ ۱۹۴۷ع کی بات ہے۔

شیخ عبدالقادر (سپریم کورٹ کے موجودہ جج) اور خالداسحاق (اسلامی مشاورتی کونسل کے ممبر) جو اُسکے زمانۂ طالبِ علمی کے ساتھی تھے، وکالت کے دوران بھی رفیقِ کار رہے۔

پاکستان بن چکا تھا۔ مہاجرین کی آمد آمد تھی اور بہت سے ہندو شاعر و ادیب انڈیا جا چکے تھے۔ شیخ ایاز انجمن ترقی پسند مصنفین سے بھی وابستہ تھا، اسکی شامیں اکثر اردو کے ادیبوں اور شاعروں کے درمیان گذرتیں۔ حلقۂ یاراں وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا اور اس نے بھی اردو میں شاعری شروع کردی۔ ریگزار سندھ کی چاندنی راتوں میں روپہلے خواب دیکھنے والا شاعر جب اپنی فضا کے ساتھ اردو ادب میں آیا تو ہر ایک نے چونک کر اسکی طرف دیکھا اور اسکا استقبال کیا، مگر معاشی مسائل نے شیخ ایاز کو کراچی چھوڑنے پر مجبور کر دیا، وہ سکھر

واپس چلا گیا اور وکالت شروع کردی اور دن رات محنت کر کے قانون دانوں کی برادری میں بہت جلد اپنے لئے ایک معتبر مقام حاصل کر گیا۔

شیخ عبدالرزاق راز لکھتے ہیں کہ سکھر میں چار سال تک شیخ ایاز نے کوئی شعر نہیں لکھا۔ حتیٰ کہ لوگ سمجھنے لگے کہ

اک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے

لیکن ایسا نہیں تھا، اسکے اندر کا مضطرب بیجل اسے اپنے کینرو سے ہم آھنگ کرنے میں مصروف تھا، وہ اندر ھی اندر فیصلہ کر رہا تھا کہ اسے کیا لکھنا چاھئے اور کس طرح لکھنا چاھئے ؟ ایک طرف ماں کے دودھ کی فطری مٹھاس تھی جو قوت نمو کی ضامن تھی اور دوسری طرف وہ جوئے شیر ، جو بےستون کاٹ کر ھی لائی جاسکتی تھی۔ اور اسکے بعد بھی یہ خوش گمانی کہ شیریں اسے مل جائے گی — خوابِ جنوں سے زیادہ نہ تھی۔ اس کشمکش میں ایک طویل عرصہ گذارنے کے بعد آخر اس نے فیصلہ کرلیا — اور ایک صبح لوگوں نے دیکھا کہ موھن جو دڑو پر آفتاب طلوع ھو رہا ھے۔

شیخ ایاز نے اپنی ذاتی ڈائری میں خود ایک جگہ لکھا ھے:

"میں کافی وقفے کے لئے ایک غیر شاعرانہ زندگی بسر کرتا ھوں اور بے انتہا دنیوی مصروفیتوں میں کھویا رہتا ھوں لیکن ایک لاوا سا کہیں تحت الشعور میں پکتا رہتا ھے۔ کسی دن اچانک جوالا کے دھانے پھٹ پڑتے ھیں اور کاغذ پر بکھرے ھوئے انگارے جگ مگ کرنے لگتے ھیں۔"

سکھر میں شیخ ایاز کا ایک خوبصورت سا گھر تھا۔ اس کے

ایک حصے میں دو متصل کمرے تھے، ایک وکالت خانہ دوسرا حجلۂ فن ــ دونوں کتابوں سے آراستہ ــ لیکن حجلۂ فن کی فضا ہی اور تھی، وہ اتنا دیدہ زیب تھا کہ اسے دیکھ کر یہ گمان ہی نہ ہوتا تھا کہ اسمیں رہنے والا کوئی ایسا شخص ہے جسے صبح سے شام تک دنیا بھر کے جرائم سے واسطہ پڑتا ہے اور وہ اپنے موکلوں کی خاطر پولس سے عدالت تک قانونی موشگافیوں میں سر کھپاتا رہتا ہے۔ اس کمرے کی آرائش میں سادگی کے ساتھ ایسی حسن کاری تھی کہ نگاہ کو سکون اور قلب کو آسودگی ملتی تھی۔ میں جب کبھی اس کمرے میں بیٹھا، مجھے یوں محسوس ہوا جیسے در و دیوار کی خامشی میں سرسوتی ستار بجا رہی ہے اور کہیں غیب سے شاعری کا نزول ہو رہا ہے۔ اس کمرے میں ادب کی اعلیٰ ترین کتابیں، جدید تر رسائل، نظر کش پینٹنگس اور خوبصورت مجسمے نہایت قرینے سے رکھے ہوئے تھے۔ بقول آفاق صدیقی

"اس میں وہ "اصنام خیالی" بھی موجود ہیں جن کو اسکی "نگاہ محرمانہ" نے لائق پرستش سمجھا اور اس "ادائے کافرانہ" کو "شعور عارفانہ" تک پہنچادیا۔ اور آسمانوں سے برستی ہوئی یا "ساقیانِ ازل" کی دی ہوئی وہ "مئے کہنہ" بھی ہے جو اسکی "روحِ آوارہ فطرت" کے لئے "تشنگیِ بجام" رہی ہے۔"

جولائی سنہ ۱۹۵۴ء میں شیخ ایاز کے اردو کلام کا پہلا مجموعہ "بوئے گل، نالۂ دل" شائع ہوا جسے اسکے رفیق دیرینہ آفاق صدیقی نے مرتب کیا تھا۔ سو صفحات کے اس مجموعے میں نظمیں بھی ہیں اور گیت بھی، غزلیں بھی ہیں اور "ہائیکو" کے انداز کے چھوٹے چھوٹے نظم پارے بھی۔ اس کتاب کے مطالعے سے پہلے

تک ایاز کا چیدہ چیدہ اردو کلام ہی میری نظر سے گذرا تھا اور اس کے سندھی کلام سے میں تقریباً ناواقف ہی تھا۔ کچھ ترجمے پڑھ رکھے تھے جن سے غصیلے جذبات کی آنچ آتی تھی یا پھر وہ دکھ پھوٹتا تھا جو عشق کی ناکامیوں کا مظہر ہوتا ہے۔ یہ عشق کہیں محبوب کا طواف کرتا نظر آتا تھا اور کہیں پریشان حال انسانیت کا، دراصل یہ اس ادبی نظریئے کی عنایت تھی جس نے پورے برصغیر، بلکہ ساری دنیا کے ادب کو خلا سے اتار کر زمین پر چلنا سکھا دیا تھا۔ نوجوان شیخ ایاز بھی اپنی دھرتی پر رہتے ہوئے دنیا کے ان تمام لوگوں کے ساتھ قدم سے قدم ملائے چل رہا تھا جو انسان کے روشن مستقبل کی طرف رواں دواں تھے۔ اس کی آنکھوں میں بھی غیر طبقاتی سماج کا حسین خواب تھا، اس کے تصورات کی نیلگوں وسعتوں میں بھی عالمی امن کی علامت "پکاسو کی فاختہ" پر پھیلائے محو پرواز تھی۔ وہ بھی زمین پر جنت کو بچھا دینے کا آرزو مند تھا — میں جب بھی اسکا کلام پڑھتا تو مجھے اس کے سینے میں بھی وہی تڑپ محسوس ہوتی جو مجھے بھی "آگ میں پھول*" کھلانے پر اکسائے رہتی تھی۔

اس کتاب کے مطالعے کے بعد شیخ ایاز کی شاعری کے کچھ اور پہلو بھی میری نظر میں آئے، وہ "بادلوں کی تہوں میں بھٹکتا ہوا" صرف "حیرت زدہ شوق وارفتہ" نہیں بلکہ اکثر مقامات پر ٹھہر کر کچھ دیر سوچتا بھی ہے۔ وہ آب و گل کی نیرنگیوں میں کوئی ماورائی کیفیت ضرور پاتا ہے لیکن اسکی بے چین روح کسی زندہ حقیقت کی تلاش میں بھی ہے۔

---

* حمایت علی شاعر کا پہلا مجموعہ کلام مطبوعہ سنہ ۱۹۵۶ء (ادارہ)

میں نے دیکھا ہے اسے
کون کہتا ہے کہ وہ جلوۂ مستور مرا واہمہ ہے
چاندنی راتوں کے احساسِ جمیل
تو بتادے کہ وہ محبوب حسیں
میری آغوش میں کسطرح مچل جاتا ہے



اے شعور عارفانہ
پردہ ہائے زندگی سے وہ نگاہِ محرمانہ
جھانکتی ہے
ہر فسانہ اک حقیقت بن گیا ہے



میکدے کو جگمگاؤ
میکشانِ پیر کی ہے یہ مئے کہنہ - پلاؤ
کیف و مستی کے خداؤ
لڑکھڑاؤ
خوب گاؤ
آج میں نے روح بادہ دیکھ لی ہے
اک نگاہِ حسن سادہ دیکھ لی ہے



لیکن اسے یہ بھی گمان ہے کہ
زندگی ایک تصور کی فسوں سازی ہے
وہ سوچتا ہے اور بہت سی حقیقتیں سوال بن کر اس کے ذھن میں ابھرنے لگتی ھیں -

پھول جھڑتے ھیں
چاند ڈھلتا ھے
یہ بدن، یہ حرم، یہ کعبۂ پاک
کیوں بنایا گیا ھے قصرِ خاک؟



بہ زیر شجر آھوانِ رمیدہ
کھڑے سوچتے ھیں
حیاتِ گریزاں، سرابِ مسلسل
سمِ تشنگی، حاصلِ زندگانی
یہ کیسا ستم ھے؟
کٹی عمر اک جرعۂ آب کی جستجو میں!



حیاتِ بشر ــ ایک خواب پریشاں
کہ ھر ایک کروٹ پہ صد اضطراب آفریں ھے
حیاتِ بشر ــ موجۂ آبِ رخشاں
کہ صدھا نہنگوں سے پہلو بہ پہلو خراماں رھی ھے
حیاتِ بشر ــ ایک طوفاں
کہ غارت گر ساحل آسودگی ھے
حیاتِ بشر ــ نالۂ نارسا ھے
حیاتِ بشر ــ نغمۂ غم فزا ھے
حیاتِ بشر ــ آخر اے دوست کیا ھے؟



سوالات کی بوچھاڑ اسے پریشان بھی کردیتی ھے اور اپنی ایک نظم میں وہ جھلّا بھی اٹھتا ھے:

پریشاں خیالو
مری زندگی کے خلا میں بھٹکتے بگولو
مجھے چھوڑ جاؤ مرے حشر ساماں سوالو
کہ میرے پپوٹوں پہ انبار بےخوابیوں کے لڑھکنے لگے ہیں
یہ میری جبیں اک سلگتی ہوئی راکھ کا ڈھیر ہے
جس پہ لاکھوں سوالات اپنی شرر باریاں کرچکے ہیں
یہ جی چاہتا ہے کہ ساری تگ و دو کو گہوارۂ خامشی
میں سلادوں

شیخ ایاز کی یہ نظم اس مجموعہ کی بہترین نظموں میں سے ہے۔ اس نظم میں بیسویں صدی کے اس انسان کا تجزیہ ہے جو آگہی کے کرب میں مبتلا ہے۔ روائتی خود فریبی کے جال سے نکل چکا ہے اور کوئی ماورائی خوش گمانی ایسی نہیں رکھتا جو اس کے ٹوٹے ہوئے یقین کو جوڑ سکے۔

کہاں جا رہے ہیں ستاروں کے یہ ان گنت کارواں؟
کسی منزلِ نور کی جستجو میں؟
مگر یہ تو میرا فریب نظر ہے
طلسمِ خیالِ بشر ہے
یہاں منزلِ نور کوئی نہیں ہے
ازل سے ابد تک کوئی جاوداں تیرگی پیچ و خم کھا رہی ہے

پھر وہ ایک زہرخند کے ساتھ اپنی دنیا کے بارے میں سوچتا ہے

یہ دنیا — یہ آماجگاہِ تمنا
کہاں جا رہی ہے؟

یہ رقاصۂ روز شب نوکِ خنجر پہ یوں ناچتی جا رہی ہے
کہ جیسے اسے یہ یقیں ہوگیا ہے
کہ اب پاؤں چھلنی نہ ہونگے!

پھر انسان کا تاریخی کردار اسکی نظر میں ابھرتا ہے۔

یہ انساں کہ صیادِ روزِ ازل ہے
کہ پھینکی ہیں کرنوں پہ جس نے کمندیں
یہ تیار کرتا ہے ہر روز ایسے انوکھے قفس کو۔
جسے توڑ دیتا ہے، پر پھڑپھڑا کر کوئی طائرِ نیم بسمل
نہ جانے مجھے کیوں یقیں ہوگیا ہے
کہ انسان خود ایک صید زبوں ہے
نہ جانے مجھے کیوں یقیں ہوگیا ہے
کہ یہ پیکرِ خاک، لاکھوں نقابِ زر افشاں بدل لے
مگر رو سیاہی چھپے گی نہ اسکی

اور آخر میں ــ دل شکن صداقت کا یہ احساس ــ ایک کربناک چیخ میں ڈھل کر تمام روشنیوں کو بجھا دینے پر آمادہ ہوجاتا ہے۔

بجھادو یہ تاروں کی قندیل
فانوس ماہ درخشاں
تصور کی اس جھلملاتی ہوئی جھیل کو
تیرگی میں چھپادو
کہ یہ روشنی میری آنکھوں کو خیرہ نہ کردے
مجھے نیند سی آ رہی ہے

اِس نظم میں "نیند" اِس صدی کے اُس بیدار ذہن کا المیہ ہے جو مسلسل اضطراب سے تنگ آکر موت کی آغوش میں چلاجانا

چاھتا ھے۔ دوسرے الفاظ میں یہ اس فتحمند انسان کا احساس شکست ھے جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا، لیکن زندگی کی شب ِ تاریک سحر کر نہ سکا۔

ادب پر اس المیے کا یہ اثر ھوا کہ اکثر لکھنے والے شکست و ریخت سے گھبرا کر، یا تو اپنی ذات کے نہاں خانوں میں چھپ گئے یا فکر و احساس کے برزخ میں مضطرب کسی صور ِ اسرافیل کے منتظر ھیں۔

مجھے اندیشہ تھا کہ شیخ ایاز کی یہ کربناک چیخ بھی کہیں صور اسرافیل کا استعارہ نہ ھو۔ آئندہ کہیں وہ بھی زندگی کی بےمعنویت کے خلا میں اتر کر اس خوبصورت دنیا سے منہ نہ موڑلے ــ لیکن ایسا نہیں ھوا۔ اس نے فلسفہٗ جدلیات کی روشنی میں زندگی کو نئے معنی دیئے، شکست و ریخت کے محرکات کو تاریخ کے پس منظر میں جانچا اور ذھنی طور پر الجھے ھوئے انسان کا سائنسی انداز میں تجزیہ کیا۔

اس کی شاعری کے آئندہ سفر میں یہی نقطہٗ نگاہ اس کی رھنمائی کرتا ھے۔

شاعری کسی زبان میں ھو، جب تک شاعر کی شخصیت کی پہچان نہ بنے، ھینگر پر لٹکے ھوئے لباس سے زیادہ نہیں ھوتی۔ اس لباس کو اپنے جسم اور اپنی شخصیت کے مطابق بنانے کے لئے بہت سی کنٹریبیونت اور نقش کاری کی ضرورت ھوتی ھے۔ شیخ ایاز کے خیالات نئے تھے، انداز بیان میں بھی ندرت تھی، مگر زبان وھی تھی جو اس کے ھمعصر شعرا لکھہ رھے تھے یعنی فارسی آمیز سندھی۔ چنانچہ جب اس نے "نغمگی کے قد بالا پر قبائے

ساز تنگ" محسوس کی تو یہ لباس ھی اتار دیا ۔ اس نے رِلّی اور اجرک کی طرف توجہ دی اور اپنی شاعری کے لئے دیسی پوشاک تیار کرنے لگا ۔

شیخ ایاز نے اس لگن میں سندھ کے دور دراز دیہاتوں کا سفر کیا اور وہ الفاظ جمع کئے جو زندگی کی متحرک اور جیتی جاگتی حقیقتوں کے ترجمان تھے ۔ تجربہ ، مشاھدہ اور مطالعہ اس کے ذھنی افق کو جتنا وسیع اور روشن کرتا گیا، اس کی دھرتی اور اس کے لوگوں کا روپ اتنا ھی نکھر کر اس کی نظروں میں آنے لگا اور بالآخر اپنی دھرتی اور اپنے لوگ اس کے محرکات شعری کا محور بن گئے ۔ وہ انسان ، حیات اور کائنات کے تخئیلی اور تجریدی مثلث سے باھر نکل آیا اور آدمی کو اس کے معاشرے میں ، اور معاشرے کو اس کے مخصوص سیاسی اور اقتصادی پس منظر میں دیکھنے لگا ۔ اس جستجو میں وہ تاریخی صداقتیں بھی اس پر منکشف ھوئیں جو کسی دھرتی ، کسی تہذیب اور کسی قوم کے تشخص کی علامت ھوتی ھیں ۔ ایاز نے اس تشخص کی کھوج میں تاریخ کا لامتناھی سفر کیا اور فرد و جماعت کی ھم رشتگی، ان کے عمل اور رد عمل، اور عہد بہ عہد بدلتی ھوئی اقدار کے آئینے میں ماضی سے لمحۂ موجود کا وہ ربط دریافت کیا جو ازل کو ابد سے باندھ دیتا ھے ۔

ایاز کی شاعری کا ٹھنڈے دل سے مطالعہ کیا جائے تو محسوس ھوتا ھے کہ تاریخ زندہ لفظوں میں بول رھی ھے ۔ کوئی لمحہ کوئی قدر اور کوئی حقیقت وقت کی گرد میں دفن ھوکر فنا نہیں ھوگئی بلکہ ایک ابدی زندگی کے خواب کی طرح

اسکے اشعار میں آنکھیں کھولے ہوئے ہے اور ایاز ان کو نئے لفظ، نئے جسد اور نئے روپ میں آباد کرتا جا رہا ہے اور انھیں اپنے عہد کی آگہی دے رہا ہے۔

ان تخلیقی کاوشات کی فنی تشکیل کے لئے اس نے نہ صرف اپنے لوک اور کلاسیکی ادب سے استفادہ کیا بلکہ برصغیر اور عالمی ادب کے عظیم فن پاروں سے بھی روشنی حاصل کی، اس نے ادب کو اقوام کی بنیاد پر خانوں میں تقسیم نہیں کیا بلکہ نوعِ انسانی کا مشترکہ سرمایہ گردانتے ہوئے خود کو اس کا وارث سمجھا اور بالخصوص برصغیر کے تاریخی ادب کو اپنی متاعِ گم گشتہ سمجھتے ہوئے اپنی شاعری میں اس کی بازیافت کی کوشش کی۔ ایاز کی اردو شاعری گواہ ہے کہ وہ اردو ادب کا بھی کسقدر مزاج آشنا ہے۔ اس کا اردو مجموعۂ کلام "بوئے گل، نالہ دل" ہو کہ تراجم کا مجموعہ "حلقہ مری زنجیر کا"۔ ناموں کے اعتبار سے غالب کے جن اشعار سے ماخوذ ہیں وہ نہ صرف غالب سے اس کی عقیدت کا ثبوت فراہم کرتے ہیں بلکہ اسکے انداز نظر کی بھی نشان دھی کرتے ہیں۔

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

اور

بس کہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیرپا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

شاہ عبداللطیف بھٹائی کے مجموعۂ کلام "شاہ جو رسالو" جیسی عظیم اور ضخیم کتاب کو اردو شاعری میں منتقل کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس ترجمے سے بھی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اسے اردو

شاعری کی روایت سے کتنی آگہی اور انداز بیان کی شائستگی پر کتنا عبور حاصل ہے۔

یہ صحرا اور گرمی دوپہر کی   یہ بیتابی مرے قلب و جگر کی
خدا جانے کہاں لے جا رہی ہے   مجھے آوارگی فکر و نظر کی

*

قعرہ دریا میں چھوڑ کر مجھ کو   یہ کہے جا رہا ہے وہ پرُ فن
کہیں ایسا نہ ہو کہ غفلت میں   بھیگ جائے ترا سرِ دامن

*

خدا جانے کہاں وہ جلوہ گر ہے   رگ جاں سے بھی جو نزدیک تر ہے

*

زمانے بھر کی خوشیوں سے ہے بہتر   وہ دردِ دل جو تیرا رازداں ہے

*

گھڑا ٹوٹا تو یہ آواز آئی   نہیں دونوں میں اب کوئی جدائی
شکستِ جسم خاکی سے ہے پیدا   ربابِ روح کی نغمہ سرائی

*

اس قدر بھی وہ بے نیاز نہیں   ہر نظر میں پیام ہوتا ہے
لب جاناں خموش رہ کر بھی   کتنا شیریں کلام ہوتا ہے

*

دل کے سوز و گداز میں جلنا   ہر ثوابِ عظیم سے بہتر
مجرمانہ غلط روی اکثر   جادۂ مستقیم سے بہتر

شیخ ایاز نے سنہ ۱۹۵۶ع میں یہ ترجمہ شروع کیا تھا جو ڈیڑھ یا دو سال کے عرصے میں تکمیل کو پہنچا، بعد ازاں چھہ ہزار دو سو تینتیس اشعار اور (۱۹۶) وائیوں کا یہ مجموعہ سندھ یونیورسٹی سے سنہ ۱۹۶۳ع میں شایع کیا گیا۔

سنہ ۱۹۵۶ع ہی کی بات ہے۔ میں نے حیدرآباد سندھ سے

ایک دو ماھی رسالہ ”شعور“ جاری کیا اور شیخ ایاز سے خواھش کی کہ وہ بھی اسکی مجلس ادارت میں شامل ھوجائے۔ یہ وہ دور تھا کہ اردو اور سندھی ادیب مل جل کر سارے کام کیا کرتے تھے - ادبی کانفرنسیں ھوں کہ مشاعرے، رسائل کی تدوین ھو کہ کتابوں کے ترجمے — اور ”شعور“ تو نکالا ھی گیا تھا اس مقصد سے کہ ھمارا ایک متحدہ حلقہ ھو اور ھم سندھ میں صحت مند ادبی شعور کی راہ ھموار کر سکیں ، اھلِ ادب جانتے ھیں کہ ھماری کوششوں اور دوستوں کی اعانت سے ارباب قلم کے درمیان کیسی خوشگوار ادبی فضا قائم تھی - شیخ ایاز نے نہ صرف شاہ صاحب کے کلام کا ترجمہ کیا بلکہ سچل سرمست، سامی ، بیدل اور سانگی کے بھی کئی شہپاروں کو اردو کا جامہ پہنایا -

شعارِ خاص سے الجھے، شعور عام سے الجھے
ھمارا مسلکِ پرواز کس کس دام سے الجھے
سر منزل شعور پا شکستہ کھویا کھویا سا
بسا اوقات اپنے ھی خیالِ خام سے الجھے



وھی موج و تلاطم ھے، وھی اپنا سفینہ ھے
مسلسل ھے حیات اپنی ، نہ مرنا ھے نہ جینا ھے
دیارِ کفر و ایماں ھے، سنبھل کر چل ارے ناداں
یہاں تو فرطِ نفرت ھے، یہاں تو شرط کینہ ھے
در و دیوار مسجد زاھدِ زنداں طلب کے ھیں
مرا تو مہہ بہ مہہ ، انجم بہ انجم ایک زینہ ھے

سحر پھوٹی، فریب زہد پھر سے کو بہ کو نکلا
'سچو' اب تک تری آنکھوں میں کیوں خواب شبینہ ہے



ہاں بتا اے شعبدہ باز حیات
کون ہوں میں، کون ہوں؟
مس خرابِ کفر و ایماں، میں اسیر ننگ و نام
میں شعار گبر و ترسا، میں شعور خاص و عام
کہکشاں پر ہے کبھی میرا مقام
اور کبھی چہرے پر گردِ صبح و شام
ہر تصور، ہر تخیل، زندگی سے انتقام
اے سمندِ ناز کی ٹوٹی زمام
کون ہوں میں — کون ہوں؟



راہ طلب میں
طبل، تمنا گونج رہا ہے
اہل سلاسل چنگ بہ لب، زنجیر بہ پا ہیں
سارے غرفۂ زنداں وا ہیں
شور بپا ہے
ساز نفس ہر ضرب صبا سے
ولولہ خیز آہنگ صدا سے
سینۂ گیتی شعلہ نوا ہے
طبل تمنا گونج رہا ہے

(سچل سرمست)



وہ دیکھو شبنم روتی ہے اور ساری دنیا سوتی ہے
ہر حرماں اپنا درماں ہے، ہر آنسو اپنا موتی ہے
یہ کیسی کوملتا کی لو ہے تیرے میرے بندھن میں
جو تیرا من برماتی ہے اور میری آنکھ بھگوتی ہے
پھر سے وہ ترنم ریز صدا جو راگ بھی ہے بیراگ بھی ہے
جو سوگ بھی ہے اور جوگ بھی ہے جو داغ عصیاں دھوتی ہے
تو پاپی ہے تو پاپی ہے اے سامی کیسا پاپ مگر
جب پاپ اسی کا پرتو ہے جو تیرے من کا موتی ہے



میں کیسے تجھے سمجھاؤں سکھی، وہ پھولوں کی کو ملتا ہے
میں ایک مہک بن جاتی ہوں جس وقت سجن گھر آتا ہے
اے کوئل اتنا کوک کہ اس پاپی کے من سے ہوک اٹھے
جو اس جیون کے پگ پگ پر ہر بھگوان کو ٹھکراتا ہے
میں اپنے من میں اک سورج کی کھوج لگائے رہتا ہوں
جب رین اندھیری ہوتی ہے، جب نیل کنول کمھلاتا ہے

(چین رائے سامی)



پھر وهي یادِ بہار آنے لگی
جسم وجاں سے بوئے یار آنے لگی
روح کی گہرائیوں سے دفعتاً
کوئی کھوئی سی پکار آنے لگی
کوئی صورت مثل نیرنگِ نظر
سوئے چشم اشکبار آنے لگی

(میر عبدالحسین سانگی)

مولانا صلاح الدین احمد نے ظفرعلی خان اور میراجی کی ترجمہ نگاری کے تعلق سے ایک جگہ لکھا ہے:

"کسی قلم کار کا کمالِ اظہار دیکھنا ہو تو تصنیف کے بجائے ترجمے میں دیکھو، افکار طبع زاد ہوتے ہیں اور وہ اپنے گھر کے لباس میں خاصے بھلے معلوم ہوتے ہیں لیکن ایک اجنبی زبان کے مصنف کے اجنبی خیالات کو اپنی زبان میں اس انداز سے منتقل کرنا کہ نہ وفا کا دامن ہاتھ سے چھوٹے نہ اظہار کی کیفیت میں فرق آئے اور نہ اپنے اسلوبِ بیان سے جدائی ہو، ہرکسی کے بس کی بات نہیں۔ ترجمے کی یہ احتیاط میں نے ظفرعلی خان کے بعد میراجی ہی میں دیکھی"۔

میں ان ناموں میں فیض اور شیخ ایاز کے ناموں کا بھی اضافہ کروں گا:

W. B. Yeats کی ایک لائین ہے:

This Night Beaten Morn,
This Spotted Light.

فیض صاحب نے کتنی خوبصورتی سے اسے اردو میں منتقل کیا ہے:

یہ داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر

کسی زبان کی ثقافتی مہک اور پیرایۂ اظہار میں لسانی لذت کی چاشنی، جس سے کسی تخلیق کا حسن عبارت ہوتا ہے، ہو بہو کسی دوسری زبان میں منتقل تو نہیں ہوسکتا لیکن صرف خیال، جذبے اور احساس کی پرچھائیاں اتارنے کے لئے بھی دونوں زبانوں کی روایات سے آگاہی اور حسنِ اظہار کی بے پناہ قدرت ضروری ہے۔ اردو میں یہ قدرت غالب، اقبال، نظم طباطبائی،

ظفرعلی خاں، میراجی اور فیض کے علاوہ شیخ ایاز میں بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ اردو میں اس کے تراجم اسلئے بھی اہم اور قابل قدر ہیں کہ وہ بنیادی طور پر سندھی کا شاعر ہے اور اس نے سندھی شاعری کو اردو میں اس خوبصورتی کے ساتھہ منتقل کیا ہے کہ اس پر اردو کے تخلیقی ادب کا گمان ہوتا ہے۔

اگر ہمارے ملک کے سیاسی حالات دوسرا رخ اختیار نہ کرتے تو اردو اور سندھی کے سنگم پر ایک ایسا شاعر بھی ہمیں مل جاتا جو اپنی انفرادی خصوصیات کے ساتھہ الگ پہچانا جاتا اور سندھ میں دونوں زبانوں کی مشترک اقدار کا نمائندہ بن جاتا۔

لیکن سیاسی حالات ایسے بدلے (۱۹۵۸-۵۹ع) کہ اُن کی زد میں سندھی زبان آگئی۔ حکومت وقت کے ایک ٹیلیفونک آرڈر پر اسے مدارس اور دفاتر سے باہر نکال دیا گیا۔ خدا جانے اس اقدام سے اہل سیاست کو کیا مقصود تھا ــ سندھی عوام اور اہل قلم یوں محسوس کرنے لگے گویا انہیں ماں کی گود سے جدا کردیا گیا ہو۔ ون یونٹ کے قیام نے ویسے ہی انہیں محرومی کے احساس میں مبتلا کر رکھا تھا۔ زبان کے چھن جانے سے یوں لگا جیسے وہ یکایک گنگ ہوکر رہ گئے ہوں۔

لیکن تاریخ شاہد ہے کہ اس قسم کے اقدامات سے نہ زبان ختم ہوتی ہے نہ تہذیب ــ یہ سرمایہ انسان کی صدیوں کی محنت کا حاصل ہوتا ہے۔ اسکی چمک دمک میں کئی نسلوں کے خون کی حدت اور پسینے کی آب شامل ہوتی ہے اور اسکی جڑیں زمین میں اتنی گہری ہوتی ہیں کہ اگر اسے زمین سے جدا کرنے کے لئے کھدائی بھی کی جائے تو موہیں جو دڑو کی شکل میں نمایاں ہوجانے کا

امکان پیدا ہوجاتا ہے۔ زبان سے اس وقتی محرومی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر مکان اور ہر گلی کوچے میں سندھی ہی بولی جانے لگی اور سندھی کے وہ بزرگ ادیب اور شاعر بھی جو ساری عمر سندھی کے ساتھ اردو میں بھی لکھتے رہے، اپنی زبان کے تحفظ میں مصروف ہوگئے۔ نئی نسل کا بد گمان ہونا تو لازمی امر تھا۔

شیخ ایاز پر یہ بات کیسے گراں نہ گذرتی، وہ کرب سے چیخ پڑا اور بلند آہنگ میں بولنے لگا۔ یہ بلند آہنگی اسکی اس دور کی شاعری میں بہت نمایاں ہے۔ آواز جب گرجدار ہو، غصے میں بھری ہوئی ہو اور اسمیں کئی اور آوازیں بھی شامل ہوجائیں تو یوں محسوس ہوتا ہے گویا طبلِ جنگ بج رہا ہے۔ حالانکہ یہ طبلِ جنگ نہیں تھا بلکہ صرف صدائے احتجاج تھی— کاش سندھ میں آباد دوسری زبانیں بولنے والے لوگ بھی دکھے ہوئے دلوں کی دھڑکنوں کو سن لیتے اور اس احتجاج میں خود بھی شریک ہوجاتے۔

شیخ ایاز کو یہ تو معلوم تھا کہ اردو کا باشعور ادیب اسکے ساتھ ہے مگر سیاسی حکمتِ عملی نے ایسی گرد اڑائی تھی کہ سارے چہرے ایک سے نظر آنے لگے تھے۔ رائٹرز گلڈ بھی جو پاکستان کی تمام زبانوں کے ادب کی نمائندگی کا اعزاز حاصل کئے ہوئے تھی، کوئی جرات مندانہ قدم نہ اٹھا سکی اور اشک شوئی کے طور پر شیخ ایاز کا سندھی کلام "بھنور بھری آکاس" (بھنورا بھرے اڑان) شائع کر کے رہ گئی۔ اسے سنہ ۱۹۶۳ع کی بہترین سندھی شاعری کے ادبی انعام سے بھی نوازا گیا مگر

کتاب ضبط کرلی گئی۔

سنہ ۱۹۶۴ع میں شیخ ایاز نے اپنا دوسرا مجموعۂ کلام "کلهي پاتم کينرو" (کاندھے دھرا ساز) شائع کیا، اس پر بھی پابندی لگادی گئی۔

پھر دوستوں کے نام لکھے ہوئے خطوط کا مجموعہ "جي ڪاڪ ڪڪوريا ڪاپڙي" شائع ہوا، وہ بھی ضبط کرلیا گیا۔

یہ زمانہ شیخ ایاز کے ذہنی اور روحاني کرب کا زمانہ تھا۔ ون یونٹ کے خلاف مغربی پاکستان کے پورے صوبوں میں تحریکیں چل رہی تھیں، ایک شاعر یا ادیب کس طرح ان مسائل سے دور رہ سکتا تھا۔ عملی سیاست سے تعلق نہ ہونے کے باوجود اس کی شاعری وقت کے تقاضوں کی ترجمان بن گئی۔ اسکے وطن پرستانہ جذبات مجروح ہونے لگے۔ وہ کچھ اور تو نہ کر سکتا تھا بجز اسکے کہ اهل سیاست کی اس عاقبت نا اندیشانہ حکمتِ عملی کے خلاف اپنی شاعري کو سراپا احتجاج بنا دے۔

اس دور میں (۱۹۶۸ع سے ۱۹۷۳ع تک) اس کے دو مجموعے اور شائع ہوئے، ایک "وڄون وسڻ آئیون" (بجلیاں برسنے آئیں) اور دوسرا "ڪي جو ٻيجل ٻوليو" (جو بیجل نے کہا)۔

ان کتابوں کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی ۔

مگر تماشہ یہ ہوا کہ اس کے ہمعصروں میں رقابت کی آگ بھڑک اٹھی اور بعض ادبی حلقوں کی طرف سے اس پر بے بنیاد الزام عائد کئے جانے لگے۔ ان کم نظروں نے اسکے استعاروں اور کنایوں کی فکری سطح تک پہنچنے کی کوشش نہیں کی بلکہ الفاظ کے ظاهری خد و خال سے اس کی روح کی شکل متعین کرنے

میں اپنے قلم کی سیاھی صرف کردی ۔ ایک شاعر کے لئے اس سے بڑا دکھ اور کوئی نہیں ھوتا جب صرف الفاظ کو اسکی شخصیت سمجھ لیا جائے ۔

بد قسمتی سے ھمارا معاشرہ لفظ پرست معاشرہ ھے۔ دوسرے معنی میں ظاھر پرست ــ وہ لفظ کے باطن میں نہیں جھانکتا ۔ نتیجہ یہ ھوتا ھے کہ ھر عہد کا بڑا لکھنے والا اپنے معاشرے کا مجرم ٹھہرتا ھے۔ اس پر فتووں کی زبانیں کھل جاتی ھیں یا اسے قید میں ڈال دیا جاتا ھے، لیکن پھر یوں بھی ھوتا ھے کہ وقت گذرنے کے بعد جب اسکے الفاظ کی باطنی روشنی نمایاں ھوتی ھے تو لوگ اس کا جشن اور یوم منانے لگتے ھیں ۔

شیخ ایاز کا المیہ بھی یہی ھے۔ ایک بار وہ کسی ادبی انجمن کی دعوت پر ھندوستان گیا، تو یہاں برادرانِ یوسف نے "چاہِ کنعان" تیار کر لیا۔ اس کی حب الوطنی معرضِ بحث میں آگئی ۔ حالانکہ ھر سال پاکستانی شاعروں کی ایک کھیپ مشاعروں میں شرکت کی غرض سے ھندوستان جاتی تھی اور ھندوستانی شعراء بھی پاکستان آیا کرتے تھے ۔ شیخ ایاز کے خلاف اس کے ادبی رقیبوں کے اس رویے کا واحد سبب یہ تھا کہ وہ موجودہ سندھی ادب کا تنہا شاعر ھے جس کا نام پاکستان گیر شہرت ھی نہیں رکھتا بلکہ ھندوستان میں بھی دور دور تک جانا پہچانا جاتا ھے۔ اسکے کلام کے تراجم اردو، پنجابی اور گجراتی کے علاوہ ھندی، مراٹھی اور بنگالی میں بھی ھوچکے ھیں اور بعض نظموں کا ترجمہ جرمن، یونانی، انگریزی اور روسی میں بھی کیا جاچکا ھے۔ ایسی صورت میں اسکے آن ھم عصروں کا حسد غیر فطری بھی نہیں ۔

ماچس کی تیلیوں کے برابر ہیں جن کے قد

(صہبا اختر)

شیخ ایاز نے اپنی "ذاتی ڈائری" میں ان رقابتوں کی یادیں بھی ایک خاص انداز میں محفوظ کی ہیں:

"کسی نے کہا ــ فلاں نقاد نے آپ کے فن پر بہت کڑی تنقید کی ہے۔ میں نے پہاڑ کی چوٹی سے نیچے دیکھا۔ ایک بچھو ایک پہاڑ کے دامن میں ایک پتھر کو ڈنک مار رہا تھا اور پہاڑ بالکل خاموش تھا ــ اٹل تھا۔"

ایاز کے اس رد عمل پر آگ کا اور دھک اٹھنا لازمی تھا چنانچہ ایسی فضا پیدا کی گئی کہ دو ایک بار بلا وجہہ ہی اسے جیل پہنچا دیا گیا۔ سیاست سے عملی تعلق نہ ہونے کے باوجود جب اس کا ہر عمل سیاسی ٹھہرا تو اس نے بھی سنہ ۱۹۷۰ء میں ایک سیاسی پارٹی سے وابستگی اختیار کرلی۔ مگر ایک شاعر کا سیاسی مصرف اس کے سوا کیا ہوسکتا تھا کہ:

تم پرچم لہرانا ساتھی میں بربط پر گاؤں گا

(ساحر لدھیانوی)

خلیفہ عبدالحکیم نے علامہ اقبال کی سیاسی زندگی کے بارے میں ایک جگہ بڑا دلچسپ واقعہ لکھا ہے:

"ایک زمانہ ایسا آیا کہ ہندوستان کے اکثر بڑے بڑے لیڈر اقبال کے اشعار سے اپنی روحوں میں گرمی پیدا کرتے تھے اور اسکے اشعار کے پیدا کئے ہوئے جوش کو عمل میں تبدیل کرتے تھے۔ ان میں سے بعض لیڈر جو شاعر کی نفسیات سے واقف نہیں تھے اقبال پر طعنہ زن ہوتے تھے کہ تم نے ہم کو تو مومن

بنا دیا لیکن خود کافر کے کافر ھی رھے۔ ایک مرتبہ مولانا محمد علی جوھر نے اقبال سے یہی کہا ـ اقبال نے جواب دیا ـ سنو بھائی، تم نے دیکھا ہوگا کہ جب قوالی ھوتی ھے تو قوال بڑے مزے اور اطمینان سے گاتا ھے۔ لیکن سننے والے ھو حق کرتے ھیں، وجد میں آتے ھیں، ناچتے ھیں، مضطرب ھوتے ھیں، بیہوش ھوجاتے ھیں، اگر یہی کیفیتیں قوال پر بھی طاری ھوں تو قوالی ختم ھوجائے گی ـ میں تو قوم کا قوال ھوں، میں گاتا ھوں، تم ناچتے ھو، کیا تم چاھتے ھو کہ میں بھی تمھارے ساتھ ناچنا شروع کردوں ؟"

(اقبال کا سیاسی کارنامہ۔ محمد اطہر خان ۔ صفحہ ۴۴۳

شیخ ایاز نے سیاست میں حصہ لیا، قید بھی کاٹی، مگر ھر بار جیل سے اشعار کے پلندے لیکر آتا رھا۔ "کپر تو کن کري" (ساحل پہ بھنور پڑے) جو اسکی شاعری کا اھم ترین مجموعہ ھے، زیادہ تر جیل ھی میں لکھا گیا ھے مگر شیخ ایاز کے فکر و فن کی اس تابناک حقیقت کو سمجھے بغیر اس کے کرم فرما اسکی شاعری کی "خطرناک ایمائیت" کے سراغ میں مصروف رھے اور ایسے دلچسپ انکشافات سے نوازا کہ وہ اپنی حالت، زار پر ایک قہقہہ لگا کر رہ گیا۔

انھیں دنوں کا ایک واقعہ شیخ ایاز نے مجھے سنایا:

"سندھ کے ایک نامور وزیر نے از راہ عنایت مجھے یہ خوشخبری سنائی کہ انہوں نے مجھے گرفتار ھونے سے بچا لیا۔ میں نے شکریہ ادا کیا مگر جب اپنا قصور معلوم کیا تو پتہ چلا کہ میں نے اپنی کسی تحریر میں نارائن شام کا حوالہ دیا تھا

جس پر تحقیقات ہو رہی تھیں۔ وزیر صاحب نے فرمایا۔ "میں نے تمہارے سپورٹ میں وضاحت کردی کہ وہ ہندؤوں کے بڑے اوتار تھے جنہیں مرے ہزاروں سال گذر چکے ہیں۔"

شیخ ایاز نے ہنستے ہوئے کہا۔ "مگر نارائن شام تو ابھی زندہ ہے۔"

وزیر صاحب میری بات کو کوئی فلسفیانہ بات سمجھ بیٹھے اور خود بھی فلسفیانہ انداز میں کہنے لگے۔ "ہاں۔ اوتار اور پیغمبر مرتے کب ہیں۔"

شیخ ایاز نے کہا۔ "مگر یہ نارائن شام تو ایک دن مرجائے گا۔"

وہ حیران ہوکر بولے "کیا مطلب!"

شیخ ایاز نے کہا۔ "میں نے ایک سندھی شاعر نارائن شام پر وہ مضمون لکھا تھا۔"

ایسا ہی ایک واقعہ فارغ بخاری کے مجموعۂ کلام "زیرو بم" کے بارے میں بھی ہے جس کی رازدارانہ تفتیش مہینوں ہوتی رہی اور بیچارے فارغ کو پریشان ہونا پڑا۔ آخر معلوم ہوا کہ اس کتاب میں "بم" بنانے کی کوئی ترکیب نہیں۔

شیخ ایاز کی کتابوں کے نام تو ایسے خطرناک نہیں مگر اس کا کیا علاج کہ مومل کے کاک محل کی لہر کا پانی سرخ تھا۔ بقول ایاز، وہ دور بھی عجیب تھا۔ اگر زیب النساء مخفی زندہ ہوتی تو اُسے بھی گرفتار کر لیا جاتا۔ اس نے بھی کہا تھا۔

سرخ پوشے بہ لبِ بام نظر می آید

سیاست سے وابستگی کے دوران شیخ ایاز جن تجربات سے گذرا، اُس کا ایک تاثر اُس نے یوں رقم کیا ہے:

"خار پشت اور سانپ کی لڑائی میں فریق نہ بنو اور اپنا راستہ لو، سانپ کا ساتھ دوگے تو وہ تمہیں بھی کاٹے گا اور خار پشت کا ساتھ دوگے تو وہ تمہارے کس کام آئے گا۔ تمہیں اسکی سست رفتاری کا ساتھ دینا پڑے گا اور سفر دشوار تر ہوجائے گا۔" (ذاتی ڈائری)

ویسے بھی شیخ ایاز سیاست کی بساط کا کھلاڑی نہیں۔ وہ شاعر ہے اور صرف شاعر، شاعری روح انسانی میں لطیف و حسین گل کاری کا نام ہے اور سیاست شطرنج کا ایک کھیل ہے جس میں مہرے تو پٹتے ہیں اور بادشاہ پر صرف شہہ پڑتی ہے۔ شاعر اور سیاست داں میں وہی فرق ہے جو آدمی اور سائے میں ہوتا ہے۔ سایہ اندھیرے میں ہمیشہ غائب ہوجاتا ہے، اور آدمی تنہا رہ جاتا ہے۔

شیخ ایاز ایک نیک جذبے کے تحت سیاست میں شامل ہوا تھا مگر بہت جلد اسے محسوس ہوگیا کہ وہ اکیلا ہی چکّی کے دو پاٹوں میں پسنے کے لئے رہ گیا ہے۔ چنانچہ وہ باہر نکل آیا اور اپنے حجلۂ فن میں آکر تخلیق شعر میں مصروف ہوگیا۔

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے، اسکی شاعری کا خمیر، تاریخ کی زندہ حقیقتوں اور صحتمند روائتوں میں سانس لیتی ہوئی اقدار سے اٹھا ہے۔ وہ فکر جدید رکھنے کے باوجود جدیدیت پسندوں کی طرح ماضی سے بےتعلق نہیں ہوجاتا اور جدت طرازی کے جنون میں ایسا روایت دشمن نہیں بن جاتا کہ لمحۂ موجود کو

کٹی ہوئی پتنگ کی طرح ہواؤں میں بےسہارا چھوڑدے۔ یہ عمل انھیں شعرا سے سرزد ہوتا ہے جنہیں تاریخ کے جدلیاتی تسلسل کا ادراک نہیں ۔ جو اپنی انفرادیت کو اجالنے کے لئے اس عطر حیات سے ناطہ توڑلیتے ہیں جو ان کی رگوں میں ان کے اب و جد کے انفاس کا ضامن ہے۔

جدید مغربی رجحانات جو ایک سیلاب کی طرح ہماری موجودہ شاعری میں در آئے ہیں اور جس کے بہاؤ میں ہمارے نئے شعرا آنکھیں بند کئے بہے جا رہے ہیں ــ شیخ ایاز کی نظر میں ادب کے لئے اچھا شگون نہیں ہے۔ وہ اس شاعری کی بےاثری اور کھوکھلےپن کا تجزیہ کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتا ہے:

”اس دور کی کوئی اپنی دیومالا نہیں ہے کہ شعرا اس سے اشاریت اور رمزیت حاصل کرسکیں ۔ مغربی شعرا تصور حسن سے وہ ناطہ برقرار نہیں رکھہ سکتے جو یونانی دیومالا میں ملتا ہے۔ دنیا تیزی سے بدل رہی ہے ، پرانی تہذیبیں ختم ہوگئی ہیں ، زندگی کی اقدار بدل چکی ہیں اور مذہبی مبلغوں میں وہ جان نہیں کہ اپنی تبلیغ کے لئے ببانگ دهل کچھہ کہہ سکیں ۔ لیکن ماضی کی روائتیں اب تک زندہ ہیں اور پرانے اشارے، کنائے اور لوک ادب، اب تک نئے ادب میں نئے رنگ روپ کے ساتھہ اور نئے معنی و مقصد کے اظہار کے لئے استعمال ہو رہے ہیں ۔ مغربی شاعری میں فلک بوس عمارتوں، ریڈیو ، انجن کی سیٹیوں اور مشینی دور کی دیگر چیزوں کا ذکر کرکے زندگی کی فوٹوگرافی تو کی گئی ہے لیکن اس شاعری میں وہ بات پیدا نہ ہوسکی جو سینے میں خنجر کی طرح پیوست ہوجاتی ہے اور قارئین میں جذبات ایک گہرے

زخم سے گرم خون کی طرح ابل پڑتے ہیں۔" (ذاتی ڈائری)

اپنے بارے میں وہ لکھتا ہے:

"میں نے ہمیشہ چاہا ہے کہ میری شاعری حقیقت کے متعلق ہو اور حقیقت کی زبان میں ہو، لیکن اس حقیقت پسندی کے باوجود میں خود کو ماضی کے ماضی اور مستقبل کے مستقبل کا شاعر سمجھتا رہا ہوں، کیونکہ اس دھرتی کی حقیقت کا ایک ناگزیر سلسلہ ہے اور اس تسلسل سے غفلت حقیقت فراموشی کے مترادف ہے۔" (ذاتی ڈائری)

شاعری میں لفظ کی اہمیت کا شعور بھی ہر شاعر کے لئے ضروری ہے۔ ایاز بھی الفاظ کی قدر اور ان کے امکانات سے بے خبر نہیں۔

"ہر لفظ کی ایک روح ہوتی ہے جو صدیوں کے مسلسل ارتقا سے گذرتی ہے۔"

"عوامی زبان کا کوئی لفظ ثقیل نہیں ہوتا۔"

"ہر بظاہر مردہ لفظ پر دمِ عیسیٰ پھونکنا بہت مشکل کام ہے لیکن اسکے بغیر شاعری پیغمبری نہیں کہلا سکتی۔"

(ذاتی ڈائری سے اقتباسات)

شیخ ایاز کو لفظ کی حقیقت کا بھی ادراک ہے اور فن کی ماورائی تاثیر کا بھی۔ وہ جانتا ہے کہ شاعری میں موسیقی ایسے رچی ہوتی ہے کہ جیسے قوسِ قزح میں سات رنگ، دھنک کو دیکھ کر جس طرح ایک ملکوتی غنائیت کا احساس ہوتا ہے اسی طرح کسی اچھے شعر کو پڑھ کر روح وجد میں آجاتی ہے، لیکن یہ کیفیت پیدا کرنا ہر شاعر کے بس کی بات نہیں، اسکے لئے اپنے وجود میں بچھی ہوئی رگوں کو ستار کے تار کی طرح پُرآہنگ

بنانا پڑتا ھے اور یہ بڑے ریاض کا کام ھے۔ شیخ ایاز نے اس ریاض سے اپنی شاعرانہ شخصیت کو گنگناتا ھوا گلزار بنا لیا ھے۔ وہ اپنے اِس غنائی تجربے کے بارے میں لکھتا ھے:

"رنگ و بو کا ترنم سے ایک رشتہ ھوتا ھے۔ رنگ و بو سے ترنم کا احساس ھو سکتا ھے اور ایک تخلیقی جینیس ترنم کو رنگ و بو میں بدل سکتا ھے۔ یہ ناممکن نہیں کہ لالۂ صحرا سے صدائے جرس سنائی دے اور ایک سندھی وائی سے موتیئے کی بو باس آئے اور اسکے الفاظ سے سفید شگفتگی کا احساس ھو۔" (ذاتی ڈائری)

بقول شاعر

ساز کی آواز پر دھوکہ ھے موجِ رنگ کا
پھول کی رنگینیوں پر اعتبارِ نغمہ ھے

جہاں تک اپنی دھرتی اور اپنے لوگوں سے محبت کا تعلق ھے، وہ اسکی پوری شاعری میں پھیلی ھوئی ھے۔ وہ کھلے لفظوں میں اعتراف کرتا ھے کہ:

"اے سندھ — تو میری ماں ھے، میں تیری سرزمین سے شاعری کا مواد حاصل کرتا ھوں، جس طرح تھر کی سرخ گائے کے تھنوں سے اس کا بچہ دودھ حاصل کرتا ھے۔"

"اے کاش — میں موت کے بعد بہشت کے دریچے سے ریگزار تھر پر ایک لہلہاتا ھوا سبز پتہ دیکھ سکوں۔"

"مجھے ھزاروں کتابوں کے مطالعے سے وہ خوشی میسر نہ ھو سکی، جو ایک بوڑھے ھاری کے جھرّیوں والے چہرے پر مسکراھٹ دیکھ کر ھوئی۔" (ذاتی ڈائری)

ظاھر ھے کہ اپنی دھرتی اور اپنے لوگوں سے محبت ھی وہ

پہلی منزل ھے جہاں سے ساری محبتوں کے راستے پھوٹتے ھیں - باھر نکلنے والا ھر قدم پہلے اپنے گھر کی دھلیز پر ھوتا ھے۔ اگر اس حقیقت کو فراموش کر دیا جائے تو محبتوں کے سارے دعوے مصنوعی اور فرضی ھو جاتے ھیں - اس نے جس صنف سخن کو بھی اپنایا اس میں یہ محبت مہکی ھوئی نظر آتی ھے۔

خوشبو کی اس وادی میں سفر کرنے سے پہلے ضروری ھے کہ ان اصناف کی تکنک، ان کی ارتقائی منزلوں اور شیخ ایاز کی شاعری میں ان کے برتاؤ پر ایک طائرانہ نظر ڈال لی جائے۔

سندھی شاعری میں دوھے اور بیت کی تاریخ بہت پرانی ھے۔ اسکی ابتدا کا سراغ سومرہ حکمرانوں کے دور میں لگایا گیا ھے۔ علاالدین خلجی سے ان کی جنگوں کے نتائج میں جو رزمیہ نغمے لکھے گئے ان کی ھیئت دوھوں سے ملتی جلتی ھے۔

"سورج نکلا مگر سویرا نہیں ھوا۔ دھاں دھاں اور دھوں دھوں کی آوازیں ھیں (خون ریز جنگ) اور اس عالم میں ابڑہ (ایک سومرہ سردار) یوں لڑرھا ھے جیسے پانی کا تیز ریلا ھر چیز کو ڈبو دے۔"

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ اور ڈاکٹر غلام علی الانہ کی تحقیق کے مطابق سومرہ اور سمہ حکمرانوں کے دور میں "گنان" (حمدیہ اور دعائیہ کلام) اور "ماموئی بیت" (پراسرار کلام - جس میں تاریخی پیش گوئیاں کی جاتی تھیں) بھی لکھے جاتے تھے جو مختلف معروف و گمنام شاعروں سے منسوب ھیں۔ معروف شعرا میں پیر صدرالدین (آٹھویں صدی ھجری)، سلطان حسین اپلانی دیپلی (شیخ بہاالدین ذکریا ملتانی کے خلیفہ)، شیخ حماد اور اسحاق آھنگر

(جن کا ذکر "تحفۃالکرام" میں ملتا ھے) کے نام نمایاں ھیں۔ اس دور تک آتے آتے سندھی شاعری میں تصوف اس حد تک رچ بس گیا تھا کہ مغربی دانشور سندھ کو (Land of Sufism) کہنے لگے۔

شیخ ایاز نے "شاہ جو رسالو" کے طویل مقدمے میں تحقیقی بحث کرتے ھوئے پروفیسر جھمٹ مل بھاونانی کی تصنیف "ڈھولا مارو" کے حوالے سے سندھی شاعری پر ڈھولا مارو دوھوں کے اثرات کا جائزہ لیا ھے۔

"ڈھولا مارو ــ راجستھان کی ایک عشقیہ داستان ھے جس کا زمانہ اب سے قریب قریب ایک ہزار سال پہلے کا ھے۔ وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ سب سے پہلے ان دوھوں کو کس نے نظم کیا۔ البتہ اس بات پر سبھی مورخ اور محقق متفق ھیں کہ سب سے پہلے اس قسم کے دوھے راجستھان، گجرات، کاٹھیاواڑ، کچھ، سندھ اور زیرین پنجاب کے علاقوں میں گھومتے پھرتے فقیروں، ڈوموں اور عوامی موسیقاروں نے ترتیب دیئے تھے۔ کشلابھ نامی ایک راجستھانی شاعر نے سولھویں صدی سے پہلے ان دوھوں کو از سرنو بنایا، سنوارا اور ان کی مدد سے بہت سی "چوپائیاں" بھی تخلیق کیں۔

ڈھولا مارو دوھوں کا اثر سندھی شعرا پر بھی ھوا لیکن ایک خاص بات جو سندھی شعرا کے دوھوں میں ملتی ھے، وہ ان کی جدت طرازی ھے۔ اس جدت طرازی کی مثالیں قاضی قاضن، شاہ کریم اور دوسرے قدیم شعرا کے یہاں تو کم ھیں، البتہ شاہ لطیف کے یہاں ھیئت اور اسلوب کے کئی ایسے تجربے ملتے ھیں جو سندھی

دوھوں کو ڈھولا مارو دوھوں سے ممتاز کرتے ھیں۔"

یہ تو ھے وہ ادبی پس منظر جو سندھ کی تاریخ میں پھیلا ھوا ھے۔ لیکن دوسری زبانوں سے اثرات قبول کرنے کے کچھ سیاسی، سماجی اور مذھبی محرکات بھی ھوتے ھیں۔ سیاسی محرکات کے تحت جب فارسی برصغیر کی سرکاری زبان قرار پائی اور صوفیائے کرام کی آمد کے بعد مذھبی اعتبار سے بھی فارسی علم و ادب کا وسیلہ بنی تو مقامی زبانیں اس سے متاثر ھوئے بغیر نہ رہ سکیں اور ان میں فارسی کے علاوہ عربی الفاظ بھی تیزی سے شامل ھونے لگے۔ لیکن ان خیالات کو جب عوام تک پہنچانے کا مسئلہ درپیش ھوا تو عالموں، شاعروں اور ادیبوں کو سادہ بیانی سے کام لینا پڑا اور یہ سادہ بیانی، عوامی الفاظ کے بغیر ممکن نہیں تھی۔

اس کے علاوہ جب مختلف مذھبی عقائد اور معاشرتی اقدار ایک دوسرے سے ھم آھنگ ھوئے تو رد و قبول کے عمل میں بعض ایسی روایتوں نے بھی شعری اظہار میں راہ پائی جو اس دور کے ادب کی پہچان سے عبارت ھے۔ مثلاً برصغیر کے سماجی پس منظر میں عورت کی وفاداری ایک امتیازی قدر کی حیثیت رکھتی ھے۔ اس سے شوھر پرستی کا جو تصور ابھرا وہ سنسکرت اور ھندی ادب میں "خدا پرستی" کا استعارہ بن گیا۔ بھگتی تحریک کے شعرا نے مذھبی اور عشقیہ داستانوں کے کرداروں سے اس استعارے کی تجسیم کی اور فطری محسوسات کی ایسی دنیا آباد کی کہ ھر محبوبہ کو اپنے محبوب میں خدا نظر آنے لگا۔ رادھا کرشن، سیتا رام، نل دمینتی، وکرم اروشی اور شکنتلا دشینت — ان سبھی قصوں میں عورت کی محبت اس انتہا پر دکھائی دیتی ھے جو " عشق

حقیقی" کی منزل ہے۔

عبدالرحیم خان خاناں کی وساطت سے ہندی دوہے جب سندھی عوام تک پہنچے اور ویدانت اور وحدت الوجود کی مشترکہ اقدار کی بنیاد پر سندھ کے صوفی شعرا نے بھگت کبیر، سورداس، تلسی داس اور میرابائی کا اثر قبول کیا اور مہدوی تحریک کے زیر اثر (سید محمد جونپوری کے توسط سے) قاضی قاضن نے اپنے صوفیانہ خیالات کی تبلیغ کیلئے عربی اور فارسی کی بجائے سندھی کا سہارا لیا تو شاہ لطیف تک آتے آتے سندھی اور ہندی شاعری کے اندازِ بیان میں یک گونہ مماثلت پیدا ہوگئی۔ خاص طور پر عورت کی زبان میں ھجر کی تڑپ اور وصال کی آرزو کا اظہار (خدا پرستی کے معنوں میں) ہندی گیتوں اور دوھوں ھی کا رھینِ منت ہے۔

شیخ ایاز نے "شاہ جو رسالو" کے مقدمے میں ان دوھوں کی بدلتی ہوئی تکنک اور سندھی شاعری میں ان کے برتاؤ کے بارے میں بھی لکھا ہے۔

"دوھوں میں عام طور پر قافیہ کا اعلان ہرایک دل (مصرع) کے آخر میں ھوتا ہے لیکن ایسے دوھے بھی ملیں گے جن میں یہ پابندی نہیں — مثلاً

سائی صورت غین سائی صورت عین کی
اوئی عین کی عین سمن نقطہ دور کرو

(سورٹھا چھند کا دوھا)

اس قسم کے دوھے تلسی داس نے بھی کہے ھیں - سندھی کے قدیم شعرا قاضی قاضن اور شاہ کریم کے یہاں بھی اسکی مثالیں

نظر آتی ھیں۔ شاہ لطیف نے ایسے دوھے کہے ھیں جو اس ھیئت پر پورے اترتے ھیں ۔ راجستھان اور سندھی دوھوں میں اس ھیئت کو اکثر کئی اور طریقوں سے بھی استعمال کیا گیا ھے۔ مثلاً مندرجہ بالا دوھے کو اسطرح بدل سکتے ھیں :

سائی صورت غین سائی صورت عین کی
سمن نقطہ دور کرو اوئی عین کی عین

اس قسم کے دوھوں کو "انت میل دوھا" کہتے ھیں ۔ سندھی شعرا میں ایسے دوھے سب سے پہلے قاضی قاضن نے کہے لیکن راجستھانی شعرا میں اس کا رواج بہت پہلے سے تھا ۔ اگر مندرجہ بالا دوھے کو اس طرح پیش کیا جائے تو "مدھ میل دوھا" بن جاتا ھے:

سائی صورت عین کی سائی صورت غین
اوئی عین کی عین سمن نقطہ دور کرو

قاضی قاضن، شاہ کریم اور شاہ لطیف کے یہاں اس ھیئت کو بھی استعمال کیا گیا ھے۔"

شیخ ایاز کے دوھوں اور بیتوں میں تکنک کی تمام صورتیں ملتی ھیں ۔ باالخصوص اسکے وہ بیت ، جو اسکے تازہ تر مجموعے "ڪپر تو ڪن ڪري" (ساحل پر بھنور پڑے) میں مسلسل نظم کی صورت میں شامل ھیں ، انداز بیان، فکر اور فنی خوبیوں کے اعتبار سے نقطۂ عروج پر نظر آتے ھیں ۔

بیت کا لفظ سندھی شاعری میں عربی اور فارسی سے مستعار ھے، لیکن سندھی شعرا نے ابیات کو دو مصرعوں تک محدود نہیں رکھا بلکہ چار پانچ یا اس سے زیادہ مصرعے بھی لکھے ھیں ۔ سندھی بیت میں قافیے کا استعمال سورٹھے کی طرح ھوتا ھے۔

("سورٹھا" اس دوھے کو کہتے ھیں جس میں قافیہ مصرعوں کے درمیان لایا جائے)۔ بیت میں قافیے کے اس التزام سے نہ صرف زور بیان پیدا ھوتا ھے بلکہ لہجے میں غنائیت بھی آجاتی ھے۔

سندھی شاعری کی ایک مقبول صنف "وائی" بھی ھے۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ھے کہ اس کے موجد شاہ لطیف بھٹائی ھیں۔ دراصل یہ "کافی" کی ایک قسم ھے جسے (بقول شیخ ایاز) شاہ صاحب نے اپنے پہلے استاد میاں نورمحمد کی "وائي" (ایک گاؤں) میں رھائش کی رعایت سے یہ نام دیا اور اپنی فنکارانہ جدت پسندی سے کام لیکر اسے ایک علیحدہ صنف کی حیثیت دیدی۔ کافی کو وائی کا نام دینے کا دوسرا جواز یہ ھے کہ سندھی موسیقی میں "کافی ٹھاٹھہ" کو ایک الگ مقام حاصل ھے۔ شاہ صاحب نے غالباً اس لئے بھی اپنے گیتوں کو وائی کا نام دیا کہ کافی ٹھاٹھہ کی راگنیوں میں اسکی انفرادیت گم ھوکر نہ رہ جائے۔

وائی کے معنی بات کے بھی ھیں اور پکار کے بھی۔ یہ ھمیشہ کسی نہ کسی سُر میں لکھی جاتی ھے اور اسکے مصرعوں میں ایک داخلی ربط موجود رھتا ھے۔ غزل کے اشعار کی طرح اسکے مصرعوں میں الگ الگ مضامین بھی باندھے جاسکتے ھیں اور اس میں مطلع اور مقطع کا التزام بھی رکھا جا سکتا ھے۔ لیکن وائی کی تکنک غزل سے مختلف ھوتی ھے۔ اس میں ایک مصرعہ بار بار دھرایا جاتا ھے جو فضا کی ھم آھنگی اور کیفیت کی شدت کو ظاھر کرتا ھے۔ ارتقائی منازل طے کرکے وائی "مستزاد" کی صورت بھی اختیار کر گئی ھے لیکن گذشتہ سو برس سے سندھی شعرا نے اس صنف سخن کو ھاتھہ نہیں لگایا تھا۔ جدید شعرا میں شیخ ایاز

پہلا شاعر ھے جس نے نہ صرف پیرایہٗ اظہار کے لئے اسے منتخب کیا بلکہ اسے کچھ اور بھی آگے بڑھایا اور اسے جدید فکر سے ھم کنار کیا۔

ان اصناف کے علاوہ غزل بھی شیخ ایاز کو محبوب رھی ھے۔ اس نے اپنی غزل میں خلیفہ گل کی روایت کو آگے بڑھانے کی کوشش کی۔ خلیفہ گل سندھی غزل کے بانی ھی نہیں ایک ایسے شاعر بھی تھے جنھوں نے سندھی کے اپنے ذخیرہ الفاظ میں شاعری کی ھے۔

خلیفہ گل کے بعد سے سانگی تک سندھی کلاسیکی غزل موضوع اور طرز ادا کے مختلف مدارج طے کرتی ھوئی ایک خاص منزل تک آئی لیکن اسکا لسانی مزاج فارسی آمیز رھا اور سندھی زبان کے اپنے استعارے، علامتیں اور محاورے اس میں بہت کم جگہ پاسکے۔

شیخ ایاز کی شاعری اس اعتبار سے بھی منفرد مرتبہ رکھتی ھے کہ اس نے غزل کو بھی اپنی لسانی مہک دی۔ موضوعات کے لحاظ سے بھی شیخ ایاز کی غزل کے افق سے اس کا عہد صاف دکھائی دیتا ھے۔ اس کا اسلوب کلاسیکی غزل سے مختلف ھے اور اس میں وہ غنائیت رچی بسی ھے جو اسکی غزل کو وائی اور بیت کی ھم رشتہ بنا دیتی ھے۔ ایاز نے سندھی غزل کو جدید فکر اور جدید حسیّت سے آشنا کیا اور اسطرح اپنی ذات سے ایک نئے عہد کا آغاز کیا۔

غزل کے علاوہ شیخ ایاز نے نظمیں بھی کہی ھیں۔ نظم چونکہ پیرایہٗ بیان میں کسی مخصوص ھیئت کی پابند

نہیں ہوتی اس لئے اس میں تجربوں کی بہت گنجائش نکل آتی ہے۔ ایاز نے پابند، معرا، آزاد بلکہ نثری نظمیں تک لکھی ہیں۔

موضوعات کے تنوع اور ہمہ گیری کے ساتھ ایاز کی نظموں میں جہاں خوبصورت دھوپ چھاؤں کی کیفیت ملتی ہے وہاں زندگی کے کڑے کوس بھی نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن داخلی اور خارجی محرکات اسکی نظموں میں منتشر نظر نہیں آتے بلکہ ایک اکائی بن کر اسطرح الفاظ میں ڈھل جاتے ہیں گویا یہ نظم کہی نہیں گئی بلکہ شیخ ایاز پر کسی خاص عالم میں اتر گئی ہے۔ دوسری اصناف سخن کی خوبی یہ ہے ان کی ہیئت الفاظ کے بے جا اسراف سے شاعر کو خود روکتی ہے مگر نظم چونکہ کسی مخصوص ہیئت اور اشعار کی مخصوص تعداد کی پابند نہیں ہوتی اس لئے بیشتر قادرالکلام شاعر اسوقت تک اشعار کہتے چلے جاتے ہیں جب تک ان کا موجود ذخیرہ الفاظ ختم نہیں ہوجاتا یا وہ خود تھک کر بیٹھ نہیں جاتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی اکثر نظمیں تکرار لفظی کا بے جان مجموعہ اور وحدت تاثر سے عاری نظر آتی ہیں۔ شیخ ایاز بھی قادرالکلام شاعر ہے مگر وہ اپنی نظم کو الفاظ کے تابع رکھنے کے بجائے خیال کے تابع رکھتا ہے، اور نظم کو وہیں ختم کردیتا ہے جہاں خیال کی تکمیل ہوجائے، چاہے اشعار کی تعداد کم ہو یا زیادہ۔

نظم نگاری کا فن تدوین کی مہارت کا مطالبہ بھی کرتا ہے۔ اردو شاعری میں اس فن کے ماہر علامہ اقبال تھے یا ہمارے پیشرو شعرا میں فیض احمد فیض اور اخترالایمان ہیں۔ ان کے علاوہ کم شعرا ہیں جو اس فن کا شعوری علم رکھتے ہوں۔ نئی نسل

نے اسطرف توجہ دی ہے مگر اس کا کیا علاج کہ ان میں قد آور ہونے کے امکانات بہت کم نظر آتے ہیں۔

سندھی میں ڈرامے کی تاریخ بہت محدود ہے۔ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی آمد سے پہلے یہاں ڈرامہ اور اسٹیج کا وجود کسی نہ کسی انداز میں رہا ہوگا لیکن کوئی تحریری ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے مرزا قلیچ بیگ ہی کو ہم سندھی ڈرامے کا اسم اول کہہ سکتے ہیں۔ یہ انیسوی صدی کے آخر کا زمانہ ہے۔ مرزا صاحب نے زیادہ تر شیکسپیئر کے ڈراموں کے ترجمے کئے ہیں۔ ان کے علاوہ جن مصنفین نے سندھی ڈرامے کو آگے بڑھایا ان میں دیوان لیلارام، کشن بیوس، منگھارام ملکانی، جھمٹ مل بھاونانی، بھیرومل مہرچند، خانچند دریانی، احمد چاگلہ اور پروفیسر رام پنجوانی وغیرہ کے نام زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ ان ادیبوں نے نہ صرف مغربی زبانوں کے متعدد شہ پاروں کا ترجمہ کیا بلکہ سنسکرت، ہندی، گجراتی، مراٹھی اور اردو کے ڈراموں کو بھی سندھی میں منتقل کیا۔ طبع زاد ڈراموں کی تعداد البتہ قیام پاکستان سے قبل اور بعد بھی بہت کم نظر آتی ہے۔ اسکی وجہ شائد یہ ہو کہ سندھی ڈرامہ تاریخ میں اپنی کوئی روایت نہیں رکھتا۔

گذشتہ تقریباً سو برس کی تحریروں کے پیش نظر سندھی ڈرامے کو تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ مذہبی، تاریخی اور سماجی ــ سماجی مسائل کی طرف سب سے زیادہ توجہ خان چند دریانی نے دی اور لوک کہانیوں پر مبنی ڈراموں کی ابتدا بھی انہیں کے نام سے ہوتی ہے۔ قیام پاکستان کے بعد جو ڈرامے لکھے گئے ان میں زیادہ تر ریڈیائی ڈرامے ہیں یا وہ ٹیلی پلیز جو گذشتہ

چند برسوں سے لکھے جا رہے ھیں۔

اسٹیج کا آغاز بھی سندھ میں ۱۸۹۴ع سے ھوا اور مختلف سوسائٹیوں اور کمپنیوں کے سہارے سنہ ۱۹۴۷ع تک جاري رھا۔ اس کے بعد یہ روائت بھی بکھر گئی۔ کبھی کبھی کوئی ڈرامہ اسٹیج ھوجاتا ھے جو محض "شوقین فنکاروں" کا رھین منت ھے۔

موجودہ سندھی ادب میں جو ڈرامے لکھے جا رہے ھیں آن میں شیخ ایاز کا نام اس لئے اھم ھے کہ اس نے تاریخ کے پس منظر میں ایسے منظوم ڈرامے تخلیق کئے جو اپنے کرداروں کی معرفت عصر حاضر کے مسائل کی ترجمانی کرتے ھیں۔ "دودي سومرہ جي موت" کا ترجمہ فہمیدہ ریاض نے کردیا ھے۔ اسکی تکنک اور شاعرانہ حسن بیان کا اندازہ اس ترجمے سے بھی ھو سکتا ھے۔ "رني ڪوٽ جي ڌاڙويل" کا پنجابی ترجمہ "جو بیجل نے آکھیا" میں احمد سلیم نے کیا ھے۔ اس ڈرامے کے پانچ کردار ھیں۔ ولھارو، وینگس، آڈھا، ڈاھڈھا، اور کاڈھا۔ یہ پانچوں نام سندھی معاشرت میں اپنا ایک خاص مفہوم رکھتے ھیں، اور اس ڈرامے میں اپنے مخصوص عمل سے زندگی کے مختلف مسائل کا تجزیہ کرتے ھیں۔ شیخ ایاز نے ان کرداروں سے آگہی کے نئے امکانات کا سراغ دیا ھے۔

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ھے۔ شاعری کے اعتبار سے شیخ ایاز کا اھم ترین مجموعہ "ڪپر ٿو ڪن ڪري" (ساحل پر بھنور پڑے) ھے جو مارچ سنہ ۱۹۷۵ع میں شایع ھوا ھے۔ (کاش فہمیدہ ریاض اسکا انتخاب بھی کرلیتیں)۔ اس کتاب میں اس کا فن، فکر کی بلندیوں پر نظر آتا ھے۔ اس میں ملکی اور قومی مسائل کے علاوہ عالمی اور بین الاقوامی مسائل پر بھی اسکی بہترین نظمیں شامل

هیں ، لیکن بڑا حصہ مسلسل ابیات اور وایوں کی صورت ان ابواب پر مشتمل ہے جو "شاہ جو رسالو" کے سُروں کی طرح مختلف لوک کہانیوں کے کرداروں سے منسوب ہیں ۔ ان ابواب میں شیخ ایاز نے فکری ندرت یہ پیدا کی ہے کہ شاہ صاحب نے جس علامتی کردار کی معرفت جس انسانی جذبے کی تصویر کشی، جس تہذیبی قدر کی نشان دہی اور جس صوفیانہ مسلک کی نمائندگی کی ہے، شیخ ایاز نے انھیں کرداروں کو اپنے عہد کے شعور میں رچا کر نئی علامتوں کے طور پر پیش کیا ہے۔ چنانچہ وہی کردار جدید انسان کے فکری مسئلوں کی نئی فلسفیانہ توجیح کرتے ہیں اور ادراک و آگہی کے نئے در باز کرتے ہیں ۔

احمد سلیم نے اس فلسفیانہ شعری عمل کے بارے میں بڑی وضاحت سے لکھا ہے:

"جب فلسفے کو نثر میں بیان نہ کیا جا سکے تو اسے ایاز کے سُروں میں محسوس کیا جاسکتا ہے، فلسفہ جب سمجھ میں آنے کے ساتھ ساتھ محسوس بھی ہونے لگے تب شاعری کی ایسی کوالٹی جنم لیتی ہے جس کے معنی ایک جگہ پر رک نہیں جاتے بلکہ رگوں میں لہو کی طرح متحرک، زندگی کا ایک عمل بن جاتے ہیں۔ "سر سوھنی" کی آخری داستان میں، وجودیت کا فلسفہ ہمیں زندگی کے اسی طرح کے عمل کی بات سناتا ہے یا پھر "موکھی متارے" میں ہمیں اس عمل کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ سر "نوری تماچی" میں شاعر کے سامنے یہ سوال ہے کہ ہیرو تاریخ کو بناتا ہے یا تاریخ ہیرو کو جنم دیتی ہے۔ سُر "ماروی" میں سندھ کے ساتھ وحدت‌الوجود کی کیفیت پیدا کی گئی ہے۔ سُر "کاپائتی" میں

فن اور فن سیکھنے کے عمل کی طرف سے منہ موڑنے کے نظریئے کا ذکر کیا گیا ہے۔ "مومل رانو" اور "سسی" میں اس آدرش کی ہلکی سی وضاحت کی گئی ہے جس کی تکمیل کے لئے شاعر کا دل ہمیشہ بے چین رہتا ہے۔ سامی کے اشلوکوں میں، شاعر، کائنات، ازل، ابد، اور زمان و مکان کے اسرار پانے میں سرگرم عمل ہے۔ سُر "سورٹھ" میں فن اور فنکار کی زندگی کے ایک ہونے کی بات کرتا ہے اور اس نکتے پر زور دیتا ہے کہ فن کو اپنی انتہا تک پہنچانے کے لئے دوسروں کے سر کی نہیں بلکہ اپنے سر کی قربانی دینی چاہئے۔ غور سے دیکھیں تو ایاز کی پوری شاعری اسی ایک نکتے کی گونج معلوم ہوگی۔ سُر "سورٹھ" آرٹ کی لہو لہان تاریخ کا ایک ایسا ورق ہے جس میں صرف انگلیاں فگار نہیں ہوتیں بلکہ سر تن سے جدا کرانا پڑتا ہے۔"

اسی کتاب میں شیخ ایاز نے اپنی جیل کی ڈائری بھی شائع کی ہے جو اس نے سنٹرل جیل سکھر میں مئی ۱۹۷۱ع سے جنوری ۱۹۷۲ع کے دوران لکھی تھی۔ (۵٦) صفحات پر پھیلی ہوئی ڈائری کا چیدہ چیدہ اقتباس بھی شاعر کی شخصیت کو سمجھنے میں مدد دے سکتا ہے:

- اے کویتا۔ تو اگنی کی طرح دھرتی اور آکاش کے درمیان ایک پل ہے جسے پار کرکے میرا من سورگ کی طرف جاتا ہے، جہاں ہرطرف اجالا ہے۔
- اگر تجھے تاریخ کا شعور ہے تو تو سمجھ سکے گا کہ بُرائی خود اپنا ناس کرتی ہے۔
- تاریخ بل کھاتی ہوئی سیڑھی کی طرح جاسکتی ہے لیکن

گول چکر نہیں کاٹتی ، وہ وہیں واپس نہیں لوٹتی جہاں سے چلی تھی۔

- حقیقت کو بدل سکیں یا نہیں —— ان آنکھوں کو بدلنا ناممکن ہے، جو حقیقت کو دیکھتی ہیں۔
- زندگی سے میرے معاہدے میں، معیاد کا کوئی فقرہ نہیں ، اس لئے میں خطرناک اترائیوں پر باگیں ڈھیلی چھوڑدیتا ہوں۔
- شاعر کی انفرادیت اس میں نہیں کہ وہ کسی خلا میں پیدا ہو اور اس پر کسی کا بھی اثر نہ ہو ، اسکی انفرادیت اس میں ہے کہ وہ ہر خوشگوار اثر قبول کرکے بھی سب سے نیارا ہو۔
- اگر شاعری پیغمبری ہے تو یہ پیغمبری صلیب کو اٹھائے بغیر نہیں ملتی۔
- عظیم شاعر بحر اور وزن بناتے ہیں ، بحر اور وزن عظیم شاعروں کو نہیں بناتے ۔ شاعری موزوں تُک بندی نہیں ہے۔ شاعری تمام زندگی کا ریاض ہوتی ہے اور شاعر کے گہرے مشاہدے اور وسیع مطالعے کا نچوڑ ہے۔
- سگ دیوانہ کی آواز سن کر تو عرفی بھی ڈرا ہوگا اور رزق سے زیادہ اسے جان کا خطرہ لاحق ہوا ہوگا۔

ایاز کی اس بصیرت میں مشرق و مغرب دونوں کا حصہ ہے۔ اس نے جہاں امارو* سے لیکر اقبال تک ذہنی سفر کی منزلیں طے کی ہیں وہاں ہومر سے لیکر سارتر ے تک — فکر کی روشنی لیکر

---

* سنسکرت کا شاعر جس کا زمانہ سنہ ۳۸۳ ق م اور سنہ ۳۸۰ ق م کے درمیان بتایا جاتا ہے — شاعر

اپنے راستوں کو اُجالا ہے۔

امارو کا تصور جمال جب اسکی روح پر اپنا عکس ڈالتا ہے تو صدیوں کی طنابیں کھنچ جاتی ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ دونوں ایک ہی عہد اور ایک ہی فضا کے شاعر ہیں۔ اس دھرتی کی عورت اپنی فطری رعنائیوں کے ساتھ جس ادائے خاص سے امارو کی شاعری میں رنگ و خوشبو بکھیرتی ہے، ایاز کی شاعری میں بھی اسکا وہی روپ ہے۔

"اس نے پھولوں کو اپنی ڈاب میں رکھ لیا اور ان
کی پتیاں سمٹ کر بند ہوگئیں۔
وہ بولی۔ لو دیکھو، یہ کیا ہوا۔
اور میں نے جواب دیا۔
تم نے اپنی کالی آنکھوں کی سیاہی سے انہیں دیکھا
اور وہ سمجھے کہ رات ہوگئی"



"طوفان کے باوجود وہ آ ہی گئی
کاش تم نے پیڑوں کے پھولوں سے اسکے بالوں پر پڑتی
ہوئی پھوار دیکھی ہوتی
کاش اس کی موتیوں کی مالا ٹوٹ کر اسکی چھاتیوں
پر چمکنے لگتی"



جس طرح اس پرندے کے بوجھ سے ٹہنی خم کھاتی ہے
اسی طرح میں تمہاری چاہت کے بوجھ سے لچکتی ہوں
پرندہ اڑ جائے تو ٹہنی پھر ویسی ہی ہوجاتی ہے
لیکن تمہارے چلے جانے پرمیں پھر ویسی نہیں بن سکتی"

(امارو۔ ترجمہ: ثنااللہ خاں میراجی)

"اسکے ہاتھ، موسل پہ ہیں اور اساڑھ کی دھوپ اسکے
سر پر اتر آئی ہے اور اسکی پیشانی سے پسینے کا ایک
قطرہ پھسلتا ہوا اسکی نتھ پر آ پہنچا ہے
موتی کیا چیز ہے۔ اس میں اس گوری کی خوشبو تو
نہیں آتی"



"اس نے دھوپ میں اپنی چولی اتاری اور جماهیاں لینے لگی
پھر اپنی چھاتی پر گرمی دانے دیکھے
پھر ایک پتھر اٹھا کر آنگن میں تکتے ہوئے کاگا کو مارا"



"گاؤں ۔ اتر کی ہوا ۔ لڑکی کی کمر پر رکھا ہوا گھڑا ...
اس کی ماں اپنے جوبن کے دن یاد کرکے مسکرانے لگی"
(شیخ ایاز)

شائد کیفیت کی اسی ہم رنگی کی بنا پر وہ اپنی ڈائری میں لکھتا ہے:

"اے امارو ۔ میں نے اڑالی تیری سندری ۔ آج وہ میری شاعری میں مہندی رچائے ہوئے ہے اور پہلے سے زیادہ تر و تازہ لگ رہی ہے۔"

امارو کا تصور حسن شیخ ایاز تک آتے آتے کئی مراحل سے گذرا ۔ کہیں وہ شکنتلا کے روپ میں کالی داس کے ناٹک کا کردار بنا، کہیں رامی کے روپ میں چنڈی داس کا محبت بھرا گیت، کہیں چتر لیکھا کے پیکر میں دل موہ لینے والی نرتکی نظر آیا تو کہیں بھاگ متی کے جسد میں قلی قطب شاہ کی غزل۔ شیخ ایاز بھی اسے مختلف نام سے پکارتا رہا ۔

آج پھر پروا چلی
پھر جُگوں کی پریت یاد آنے لگی

میں تجھے پھر ڈھونڈھتا ھوں آروشی
میں کہ وکرم بھی ھوں کالی داس بھی
(نیل کنٹھ اور نیم کے پتے)

اور جب شیخ ایاز نے اُسے قریب سے دیکھا تو اسکی روح زخمی تھی۔ پتھر کی آنکھوں والے انسانوں کو اس میں کچھ نظر نہ آیا تھا۔ عہد بہ عہد اس پر اتنی خاک اڑائی گئی تھی کہ سامی تک آتے آتے اس کی صورت ھی بدل گئی اور اس کے وجود کو خدا کی طرف جانے والی راہ کا پتھر سمجھ لیا گیا۔

شیخ ایاز نے اس پتھر کو اٹھا لیا اور اپنی شاعری کے رنگ رس میں بسا کر اسے مہکتا ھوا گلاب بنا دیا۔ اس نے سامی سے کہا:

"اے سامی۔ تم کہتے ھو کہ یہ استری، یہ بندھن جو پرش کو دھرتی سے باندھ دیتا ھے، مکڑی کا جالا ھے۔ گھاٹ کے نیچے کی پھسلن ھے۔ پاپ کا گڑھا ھے۔ مایا کی لچکتی ھوئی ڈال ھے چھل کپٹ کا برکھش ھے۔ نرک کا دوار ھے۔

اور میں کہتا ھوں کہ یہ گلاب دانی ھے۔ گاؤ تکیہ ھے۔ پیار کی رم جھم ھے۔ لاجونتی ھے۔ کنول دیپ ھے۔ مامتا کا دودھ سے بھرا ھوا کٹورا ھے۔ سورگ کا دوار ھے۔ ایک آدی اور انادی پکار ھے۔ جس پر کان بند کرنا پرش کا سب سے بڑا پاپ ھے۔" (ذاتی ڈائری)

لیکن اپنے عہد کے تپتے ہوئے صحرا میں جب اس کا اپنا

وجود بکھرنے لگا، تاریخ ریزہ ریزہ ھوکر ملبے کا ڈھیر بننے لگی اور کھلا نیلگوں آسمان مقبرے کے گنبد کی طرح اس کی دھرتی پر تنگ ھونے لگا تو سارترے کی وجودیت اسے "دیوانے کا خواب" نظر آئی۔ اس نے کہا:

"اے سارترے۔ اگر تم یہاں پیدا ھوتے۔ ایک سندھی
کے گھرانے میں۔
اور پھر میری طرح وجودیت کا فلسفہ اپنی زندگی میں
اپناتے ــــــ تو تمہیں حقیقت کا پتہ چل جاتا ــ
مغرب، مشرق کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔
تم نے اپنی ترازو کے پلڑے میں بہت سی آزادی بغیر
تولے ڈالدی اور اپنی دکان کو چمکا لیا۔
یہاں تو آزادی کا نام لیتے ھیں تــو سرو سامان اور
گھر بار کو آگ لگ جاتی ھے۔
سارترے۔ میں تو سمجھتا ھوں کہ وھی انسان بڑا ھے
جو خود آگ سے اشنان کرکے تر و تازہ ھوکر نکلتا ھے۔
اے گرو۔ تمہارا گیان بیکار ھے۔
تم تو اوروں کو اس آگ سے اشنان کرنے پر اکسا
رھے ھو"

(ایاز کی ایک نظم)

شیخ ایاز جانتا ھے کہ وجودیت اور آزادی کے درمیان ایک آگ کا دریا بھی ھے جسے تیر کے پار کرنا پڑتا ھے۔ مشرق ابھی اسکو پار کرنے کا صرف عزم کر رھا ھے۔

وہ یہ بھی جانتا ھے کہ شاعری اس آتشیں منزل میں کیا کردار ادا کر سکتی ھے۔ اسکے کانوں میں ان شاعروں کی آوازیں

بھی گونجتی رھتی ھیں جو اپنی اپنی زمین پر اپنے اپنے خوابوں کی تعبیر کے لئے نغمہ خواں رھے اور انکی آواز تاریخ کی آواز بن گئی۔

ایسے شاعر جن کے کلام میں اسے اپنے دل کی دھڑکن سنائی دیتی تھی، تین تھے۔ اسپین کا لورکا ــ روس کا مایا کافسکی ــ ترکی کا ناظم حکمت۔

اسکی وجہ شاید یہ ھو کہ یہ تینوں شاعر اپنی زندگی میں انھیں حالات سے گذرے جن سے شیخ ایاز دوچار رھا اور ان کے کلام میں اس نے وھی حدت و شدت محسوس کی جو اسے اپنے شاعرانہ وجود میں محسوس ھوتی تھی۔

لورکا جس طرح جپسی لوک گیتوں سے اثر قبول کرتا تھا، شیخ ایاز بھی سندھ کے دیہاتوں میں جاکر غریب ھاریوں، مچھیروں اور بنجاروں کی زندگی کا مطالعہ کرتا اور ان کی فطری معصومیت، تصنع سے پاک محبت اور صدیوں کی سینہ بہ سینہ روایت کے حسن کو اپنے دامنِ شعر میں سمیٹ لیتا۔ لورکا کی طرح اس نے بھی تھر کے لوک گیتوں کے آھنگ سے اپنی شاعری کی لے تراشی ھے۔

مایا کافسکی نے اسے یوں متاثر کیا کہ اس نے بھی ادب میں ایک انقلابی زندگی گذاری ھے۔ پبلونرودا کہتا ھے: بلاشبہ مایا کافسکی کی طاقت، لطافت اور غضبناکی آج تک ھمارے دور کی شاعری میں بے مثال ھے۔

”آگے بڑھتے ھوئے برسوں کی گرجدار آواز سنو ــ یہ انسانی ارتقاء کا جمع شدہ غصہ ھے۔“ (مایا کافسکی)

شیخ ایاز نے بھی صدیوں کے جمع شدہ عوامی غصے کو اپنے اشعار میں بھڑکا دیا ہے۔

مایا کافسکی کی مشہور نظم "ایفل ٹاور" کی گونج ایاز کی نظموں میں بھی مختلف انداز میں سنائی دیتی ہے۔ اسکی قدآور شخصیت سندھ میں بھی خود ایک "ایفل ٹاور" کی علامت ہے جسے وہ جاگیرداری معاشرے کی قحبگی سے نکال کر محنت پسند معاشرے کے چوراھے پر نصب کر کے مینارۂ نور بنا دینے کا آرزومند ہے۔

شیخ ایاز کا تیسرا محبوب شاعر ناظم حکمت ہے۔

ناظم حکمت کی طرح ایاز نے بھی قید و بند کی صعوبتیں برداشت کی ھیں۔ لوئی اراگاں نے ناظم حکمت کو ترکی کا مایا کافسکی کہا تھا۔ شیخ مجیب نے شیخ ایاز کو سندھ کا نذرالاسلام کہا، اراگاں نے مایا کافسکی کی جو خصوصیات ناظم حکمت میں دریافت کیں — "خروش، عظمت، بے باکی" — وھی خصوصیات نذرالاسلام کے بعد شیخ ایاز میں نظر آتی ھیں۔

ناظم حکمت اور شیخ ایاز میں بہت سی باتیں مشترک ھیں۔ میں نے جب شیخ ایاز کی نظم " ترازو ھیں آنکھیں " پڑھی تو مجھے بے اختیار ناظم حکمت کی وہ نظم یاد آگئی جس میں اس نے محنت کش ھاتھوں کی ثناخوانی کی ہے۔ اس کا بنیادی خیال یہ ھے کہ دنیا کی ھر چیز جھوٹی ھے، صرف یہ ھاتھ سچے ھیں۔ شیخ ایاز نے بھی آنکھوں کو ترازو کہہ کر انھیں انصاف اور ایمانداری کا استعارہ بنا دیا ہے۔

ترازو ہیں آنکھیں
ہماری ترازو ہیں آنکھیں
بہانے سے پلڑا جھکانا نہ جانیں
کبھی جھوٹ سے یہ نبھانا نہ جانیں
گنوں کی جو ڈانڈی اٹھائیں تو جانچیں
سدا دیس کی دیس سے تول پوری
کبھی منصفی میں
خیانت نہ کی، لاشعوری، شعوری
کبھی دھول سے دھن نہ تولیں، نہ تولیں
نہ کافر نہ مومن — سدا پیت رولیں (ترجمہ: فہمیدہ ریاض)

یہاں ایک بات اور بھی کہتا چلوں — آنکھوں کے لئے اسی قسم کی تشبیہ ایک قدیم ہندی دوہے میں بھی استعمال کی گئی ہے:

بھنوں ڈانڈری، کانٹو تلک، پل پٹ، پتلی باٹ
مورت تولت مترکی، نیہہ نگر کی ھاٹ

(اسکے ابرو ترازو کی ڈنڈی ہیں جن کے درمیان تلک کا نشان کانٹا ہے۔ آنکھیں ترازو کے پلڑے ہیں اور پتلیاں — باٹ، اس ادا سے وہ بازار حسن میں بیٹھی ہے)

عہد بہ عہد بدلتی ہوئی اقدار کا فرق، اس ایک تشبیہہ کے دو مختلف انداز میں استعمال سے واضح ہوجاتا ہے۔ دراصل یہ آگہی کے دو زاوئیے ہیں۔ ایک زاویۂ نگاہ اپنے عہد کے سماج میں عورت کو جس روپ میں دیکھتا ہے اسی میں حسن کا نکتہ پیدا کرتا ہے۔ اور دوسرا زاویۂ نگاہ اپنے عہد کے شعور کا ترجمان ہے اور آنکھوں کی معرفت انسان کو "حقیقت نگری" پر اکساتا ہے۔ اور انصاف و ایمانداری سے اسکی فطری وابستگی کی طرف اشارہ کرتا ہے—

یہی دوسرا زاویۂ نگاہ شیخ ایاز کی شاعری کی پہچان ہے۔
ایک جگہ بڑے دکھ سے اس نے خود اپنی شاعری سے سوال کیا ہے:

"اے دھوپ کے بالوں والی اگنی، اے میری کویتا، کیا آج تک کسی نے تیرے مکھڑے سے لٹیں ہٹا کر تجھے دیکھا ہے؟"

اسکا جواب اسکی شاعری نے دیا ہو یا نہ دیا ہو، لیکن میں جانتا ہوں کہ بہت کم لوگوں نے اسکی شاعری کا چہرہ دیکھا ہے۔ بالخصوص اردو داں طبقہ تو اسکے بارے میں متعدد غلط فہمیوں کا شکار رہا، اور سندھی دانوں میں بھی نوجوانوں سے قطع نظر، روائت پسند طبقہ عموماً اس سے برگشتہ خاطر ہی رہا۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ شیخ ایاز دو زمانوں کے موڑ پر کھڑا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں ماں باپ بھی اپنی اولاد کو نہیں سمجھ پاتے اور انہیں ناخلف ٹھہرا دیتے ہیں۔

شیخ ایاز جب ایک زقند لگا کر سندھی ادب میں نمودار ہوا تو وہ خلا پیچھے چھوڑ گیا جسے اسکی روائتی اصناف سخن، وائی، دوھے، بیت بھی پر نہ کر سکے۔ بات یہ ہے کہ شاعری میں لفظ تو پرانے ہی ہوتے ہیں مگر وہ جب استعارہ اور علامت بن کر نئے معنی و مفہوم دینے لگتے ہیں تو لغت منہ دیکھتی رہ جاتی ہے۔ تلمیحات پرانے محاکاتی پس منظر کے باوجود پیش منظر کے نئے رنگ اور نئے خطوط میں ڈھل جاتی ہیں اور ان کی دنیا ہی بدل جاتی ہے اور جیسا کہ میں نے پہلے کہیں لکھا ہے کہ لفظ پرست معاشرہ اس معنوی تبدیلی کو جانے بغیر مستعمل الفاظ ہی کو شاعر کی شخصیت سمجھ لیتا ہے۔ شیخ ایاز کے بارے میں

غلط فہمیوں کا راز بھی اسی میں پوشیدہ ہے۔

زاہدِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلماں ہوں میں

میری نظر میں شیخ ایاز ایک صوفی منش، حریت پسند اور وطن دوست شاعر ہے۔

ٹھہر اے حسنِ ازل
آج میری آتما کی پیاس بجھتی ہی نہیں

٭

کیسا غیب، شہود
سب کچھ، تو ہی تو
چندا بھی چاکر ہے تیرا
سورج کرے سجود
سب کچھ، تو ہی تو
تو ہی ہے اپنی منزل
اور تو ہی لا محدود
سب کچھ، تو ہی تو

٭

میں گرجا تو گونج
میں مندر تو ناد
کیوں تو میری نیند
روز اڑائے رے
کاہے جگائے رے
میرے آد جگاد

٭

پہلا پہلا
لفظ خدا کا
کن فیکون
شاعر۔ موسیقار۔ مصوّر
سب میں ایک ہی جوشِ جنوں
کن فیکون

(ترجمہ: فہمیدہ ریاض)

وائیوں اور نظموں کے یہ چند سادہ سے بند جو میں نے چلتے چلتے چن لئے ہیں، اس کے ذہن کے کس رخ کی نمائندگی کرتے ہیں؟ کیا یہ ایک صوفی کی سوچ نہیں؟

ساری جیون مایا، سپنا، سپنے اس میں ہزار
تو سپنا، سپنے کا سپنا، کس کو ڈھونڈھے رے

کیا اس شعر کو پڑھ کر غالب کا یہ شعر یاد نہیں آ جاتا؟

ہے غیبِ غیب، جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

کیا یہ بھی ایک صوفیانہ مسلک نہیں؟ (اس مسلک سے اختلاف ایک دوسرا مسئلہ ہے جس سے یہاں بحث نہیں —)

اب آئیے اسکی حریت پسندی کی طرف —

آزادی۔ انسان۔ سمجھو ایک ہی بات ہے
آزادی بن آدمی، کنکر کاٹھ سمان
سمجھو ایک ہی بات ہے
جس کو لاج کا پاس ہے وہ انسان مہان
سمجھو ایک ہی بات ہے

❋

میں نے زنجیر پہنی اور آزاد ہوں
تو تو ظالم سدا سے ہے زندان میں



اڑ کر کوئی تان بھرو
کب تک روکے گا آن جل



یہ کھلے کنول سے پاؤں تھے
جو کاٹ گئے پربت لوگو



میں دیتا ہوں گیت تجھے او دھرتی
تو دیتی ہے زنجیر مجھے
میں نے تجھے کیا کیا گیت دیئے
کیا سپنا سپنا گیت دیئے
میں دیتا ہوں جیت تجھے او دھرتی
تو دیتی ہے زنجیر مجھے



دان نہیں دی دات
مول چکایا ہے میاں
یہ جو قید قبول کی ، اٹھ کر آدھی رات
مول چکایا ہے میاں

دیکھ اندھیری قید میں چمک رہا پربھات
مول چکایا ہے میاں



سچ میں اور سپنے میں دوری، جو بھی مٹائے
بول، میں اسکی باندی ری
سچ صدیوں کا، گیت کے اندر، جو بھی سمائے
بول، میں اسکی باندی ری

(ترجمہ: فہمیدہ ریاض)

وطن دوستی کا جذبہ اس وقت تک معتبر نہیں ہوتا جب تک شاعر کے اشعار سے وطن کا درد نہ چھلکے اور یہ درد مسائل وطن کا آئینہ ہوتا ہے۔

یہ دیس جلا ہے نفرت سے
یہ دیس کڑھا ہے کینے میں
اب امرت رس کو ڈھونڈھ رہا
میں اپنے خون پسینے میں



اس دیس پہ یرقان چھائی ہے
اس کے ہر جاگ اور سپنے میں
اک ہلدی سی یکجائی ہے



آنکھیں لہو لہان ہیں۔ اپنی دھرتی پر
انسانوں کے سر، کاٹیں ہاتھ انسان کے



میں اپنے دیس کے آگے جب
اندر کا دکھڑا روتا ہوں
وہ الٹا مجھ پر وار کرے
دل کیا کہتا ہے۔ کیسے کہوں



بے موت مرے ہیں تیرے لئے انسان ہزاروں، میں ہی نہیں
اس دنیا میں اے دیس ہوئے نادان ہزاروں، میں ہی نہیں



او میرے محبوب وطن
وہی ہے تجھ سے نیہہ لگا
یہ میرا مظلوم قلم
مصلحتوں سے دور رہا

(ترجمہ : فہمیدہ ریاض)

لیکن اسکے باوجود آس پر یاروں کی سنگ زنی ہوتی رہی، اور اسے اپنی مدافعت میں کہنا پڑا :

ہیرے تو نہارو اے لوگو، کنکر مت مارو اے لوگو
دیکھو تو ہنر پھر بات کرو، کیوں شور مچایا ہے پیارے

ایاز نے جگہ جگہ دھرتی اور انسان کے ناطے سے اپنی پہچان خود بتائی ہے۔

تیرے چرن چھوؤں — او دھرتی او میری ماں
انساں انساں کے گلے، لگ کر جھوم اٹھوں
اور نہ کچھ جانوں، میں تو پیت پکار ہوں



ان چند کھلی حقیقتوں کے علاوہ اس کی شاعری کے اور کئی لطیف اور پراسرار پہلو ھیں جو اسکے فکرانگیز استعاروں اور گلرنگ کنایوں میں چھپے ھوئے ھیں۔ صرف دیکھنے والی آنکھ چاھیے۔

تونے کب دیکھا ھے میرے سپنے کا سوراج
جس کے آگے کچھ بھی نہیں ھے یہ جمنا یہ تاج

میں نے جگہ جگہ اس کی ذاتی ڈائری سے بھی اقتباسات پیش کئے ھیں تاکہ معلوم ھو کہ وہ خلوت میں اپنے آپ کو کس زاویے سے دیکھتا ھے۔ ایک جگہ اس نے لکھا ھے:

"آدھا سچ، جھوٹ سے برا ھوتا ھے۔ جھوٹ، سچ سے محبت کرنے والوں کو دھوکہ نہیں دے سکتا۔ لیکن آدھا سچ، انہیں فریب میں مبتلا کرسکتا ھے۔"

سندھ یونیورسٹی کا وائس چانسلر* بننے کے بعد مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں وہ "آدھے سچ" کے دلدل میں نہ پھنس جائے اور اسکے سینے میں کینرو بجاتے ھوئے بیجل کی آواز گھٹ کر نہ رہ جائے۔ مگر ایسا نہیں ھوا۔ بیجل کی آواز ھر لمحہ اسکے ساتھ رھی، وہ دنیا کے جس ملک میں بھی گیا — روس، یورپ، ترکی، سعودی عرب — بیجل اسکا ھمسفر رھا۔ اور اپنے ساز پر نت نئے گیت گاتا رھا۔

کچھ دن ھوئے اس نے مجھے اردو اور سندھی کی بے شمار پابند، معرا، آزاد اور نثری نظمیں سنائیں، اور اس ناول کے بارے میں بھی بتایا جس کا تانا بانا وہ فرصت کے اوقات میں بنتا رھتا ھے۔ اس کا خیال ھے کہ یہ ناول اس کی زندگی کا سب سے بڑا تجربہ ھوگا۔

---

* شیخ ایاز ۲۳ جنوری ۱۹۷۶ء کو سندھ یونیورسٹی، جام شورو کے وائس چانسلر بنائے گئے۔

(شیخ ایاز افسانہ نگار بھی ہے۔ اس کے افسانوں کا ایک مجموعہ "سفید وحشی" اپریل ۱۹۴۷ء میں چھپا تھا اور دوسرا "پنھل کان پوء" (پنوں کے بعد) سنہ ۱۹۵۰ء یا ۱۹۵۱ء میں)۔

اسکے علاوہ علامہ اقبال کے منتخب کلام کا منظوم سندھی ترجمہ بھی (جس میں آج کل وہ مصروف ہے) یقیناً اس کا ایک کارنامہ ہوگا۔

اسکے اردو کلام کا نیا مجموعہ "نیل کنٹھہ اور نیم کے پتّے" بھی زیر ترتیب ہے۔ اس کی اشاعت کے بعد اسکی شاعری کے کچھہ اور امکانات بھی نمایاں ہوں گے، اور میرا خیال ہے کہ اپنے موضوعات اور انداز بیان کی ندرت کے اعتبار سے وہ اردو میں بھی الگ پہچانا جاسکے گا۔

نسل نو
تو سایۂ ابلیس میں
جب ہوئی پل کر جواں
میں نے اک تصویر تیرے سامنے
لا کے رکھی دفعتاً انسان کی
تونے حیراں ہو کہ دیکھا اور کہا
یہ تو اک ابلیس ہے

شیخ ایاز کی اردو نظمیں نسبتاً طویل ہیں۔ ان کے اقتباس سے موضوع کھل کر سامنے نہیں آسکتا اس لئے صرف اتنا کہوں گا کہ اس کتاب کا انتظار کیا جائے۔ اس مجموعے میں اسکی جو نظمیں شامل ہین ان مین "لطیف اور خسرو"۔ "دھرتی کے بھاگ"۔ "قبرستان مکلی میں" اور "پرتگال" کے علاوہ اور بہت سی ایسی نظمیں اور وائیاں شامل ہیں، جن کا اس نے کوئی عنوان نہیں رکھا بلکہ خیال بہ خیال اور جذبہ بہ جذبہ لکھتا چلا گیا اور اپنے

نئے نئے امکانات کی راھیں کھولدیں - اس کلام کی ایک نمایاں خوبی یہ بھی ھے کہ موضوع اور فضا کے اعتبار سے اس نے زبان بھی مختلف استعمال کی ھے - بوجھل الفاظ سے ممکنہ حد تک گریز کیا ھے، تراکیب اور اضافتوں سے بھی دامن بچایا ھے اور زیادہ تر ھلکے پھلکے، گنگناتے ھوئے، میٹھے اور رس دار لفظ استعمال کئے ھیں، اس احتیاط سے اس کے کلام میں ایک نیا لطف پیدا ھوگیا ھے۔

دو سال پہلے احمد سلیم نے پنجابی زبان میں اسکے منتخب کلام کا منظوم ترجمہ کیا تھا جو سندھ یونیورسٹی کے شعبۂ سندھیالاجی کے زیر اھتمام "جو بیجل نے آکھیا" کے نام سے شائع ھوچکا ھے -

فہمیدہ ریاض کا یہ منظوم ترجمہ جو "حلقہ مری زنجیر کا" کے نام سے چھپ رھا ھے، اس اعتبار سے زیادہ اھم ھے کہ اردو کی وساطت سے شیخ ایاز کی شاعری کو کسی حد تک جاننے کا یہ پہلا وسیلہ ھوگا۔ اس کتاب کے مطالعے سے ممکن ھے کچھہ غلط فہمیوں کا بھی ازالہ ھوجائے - لیکن شیخ ایاز کو پوری طرح سمجھنے کے لئے محض تراجم کافی نہیں - اس کے لئے سندھی زبان کا جاننا اور سندھی شعری روایت کا مزاج آشنا ھونا بھی بےحد ضروری ھے، بقول پیرحسام‌الدین راشدی، ایاز، شاہ بھٹائی، سچل سرمست اور سامی کے بعد سندھی کا سب سے بڑا * شاعر ھے اور بعض خصوصیات

---

* ایاز کے بارے میں یہی رائے ڈاکٹر جی- ام- مہکری کی بھی ھے-

The coming generation of the Sindhis will envy us of this generation in the same way as we envy those who had the good luck to see, hear and converse with three earlier greatnesses of Sind, Shah Latif, Sachal Sarmast and Sami. The Shaikh is the fourth pillar of the mighty edifice called the Sind Culture.

کی بنا پر شاہ لطیف کے بعد شائد اسی کا نام لیا جائے۔

یہ سطور لکھتے ہوئے میں بھی انتہائی شرمندگی کے ساتھ یہ اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے بھی سندھی میں اتنا درک حاصل نہیں کہ شاہ اور شیخ کی شاعری کو ان کی شعری زبان کا لطف لیتے ہوئے پڑھ سکوں۔ لذت کام و دھن میں زبان کے ثقافتی ذائقے سے محرومی کا احساس اکثر کنکری کی طرح دانتوں کے درمیان آجاتا ہے اور میں تلملا کر رہ جاتا ہوں۔

فہمیدہ ریاض نے اپنے ترجمے کے لئے عظمت اللہ خاں، آرزو لکھنوی اور میراجی کی زبان منتخب کر کے سندھی زبان کی لطافت کو بڑی حد تک ضائع ہونے سے بچالیا ہے۔ اس زبان میں اور سندھی میں نہ صرف لفظی یگانگت ہے بلکہ لسانی فضا بھی کم و بیش یکساں نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر مقامات پر اصل شاعری کی مہک بھی ان ترجموں میں محسوس ہونے لگتی ہے۔ شیخ ایاز کے کلام کی ایک خوبصورتی یہ بھی ہے کہ اسکے کسی مصرعے میں کوئی حرف حذف نہیں ہوتا جب کہ اس نے مروجہ اوزان کے علاوہ کچھ نئے میٹر بھی تخلیق کئے ہیں۔ فہمیدہ نے چونکہ اپنے ترجمے میں بھی انہیں اوزان کو برتنے کی کوشش کی ہے اس لئے کسی قدر اس غنائیت کی بھی ترسیل ہو گئی ہے جو ایاز کی شاعری کی بنیادی خصوصیت ہے۔

فہمیدہ ریاض نے جس محنت، خلوص اور تخلیقی لگن کے ساتھ یہ ترجمہ کیا ہے وہ بلاشبہ اس کے شاعرانہ ہنر کی دلیل ہے اور اپنی مثال آپ ہے۔

آخر میں جی چاہ رہا ہے کہ شیخ ایاز کی دو نظموں کے ترجمے

اور سناتا چلوں جن میں سے ایک اس نے نئی نسل کے نام بڑے پیار سے لکھی ہے اور دوسری، اپنی موت کے نام جو یقیناً اسے کبھی نہ مار سکے گی۔

(۱)

میرے چنگ نے مجھے ایک کالے سانپ کی طرح کاٹ
لیا ہے
میرے زہر سے سوجے ہوئے انگ انگ کو،
میرے بعد آنے والو ــ کاش تمہیں نہ دیکھنا پڑے

مجھے یاد نہیں کہ مجھے زندگی میں کوئی سہارا ملا
یا کسی نے ڈھارس بندھائی ہو
میری طرح پہاڑوں کا دور و دشوار سفر۔
میرے بعد آنے والو ــ کاش تمہیں نہ دیکھنا پڑے

میں نے جب قدم بڑھایا تو سورج تانبے کی طرح تپ گیا
اس جلتی ہوئی ریت میں سلگتے ہوئے پاؤں کی جلن
میرے بعد آنے والو ــ کاش تمہیں نہ دیکھنا پڑے

جیسے کوئی راکھشس اپنے شکار کو دیکھ رہا ہو
ایسا آکاش جو میں نے دیکھا
میرے بعد آنے والو ــ کاش تمہیں نہ دیکھنا پڑے

یہ راتیں روگی ہیں اور پل پل صدیوں کی پیپ کی
طرح ہیں

میرے پاؤں کے نیچے جو زمین ہے۔
میرے بعد آنے والو ۔ کاش تمہیں نہ دیکھنا پڑے

کاش اس دیس میں کسی کے گالوں سے خون کے آنسو
بہہ کر تمہارے پیالے میں نہ پڑیں
میرے حصے میں آنسوؤں میں بھیگا ہوا جو بھات آیا ہے۔
میرے بعد آنے والو ۔ کاش تمہیں نہ دیکھنا پڑے

کل تم سبھی بے خطر اور آزاد ہو کر رہو
اور یہ دکھ، جو میری ماں نے جنم سے مجھے ورثے
میں دیا ہے
میرے بعد آنے والو ۔ کاش تمہیں نہ دیکھنا پڑے

(۲)

میں نے اپنی زندگی کو ایک شعلے میں تبدیل کر دیا ہے
اور میری سانسوں سے کئی امر گیت ابھر آئے ہیں
موت کو کیا معلوم کہ میں اس کے لئے فقط راکھ
چھوڑ کے جا رہا ہوں

اے موت، تجھے مجھ سے فقط مٹھی بھر ہڈیاں ہی
مل سکتی ہیں
اس ڈگر پر جاتے ہوئے میرے محبوب مجھے ایک
عقاب کی طرح جھپٹ کر اٹھالیں گے

اے میاں، میں تمہیں بھی مٹھی بھر ھڈیاں ھی نذر
کر سکتا ھوں
کل میرے گھر میں ھزاروں گیت مہمان تھے
میرے پاس جو کچھ تھا میں نے تمہیں دیدیا
اب میں حیران ھوں کہ تمہیں کیا پیش کروں۔

مٹھی بھر ھڈیاں — موت کے لئے
دیکھو وہ کیسے واپس لوٹ رھی ھے
اور میں بادلوں کے پیچھے کھڑا ھوا اس پر قہقہے
لگا رھا ھوں
بھیک لئے بغیر نہ جانے والے بھکاری پر
آج تک کسی نے ایسا طنز نہ کیا ھوگا
سازندہ تو فقط ساز ھی ھوتا ھے
باقی تو فقط مٹھی بھر ھڈیاں ھی ھوتی ھیں۔

اے موت، دیکھ، میں نے منزل پر پہنچ کر تجھے
کیسا سبق دیا ھے
میں نے اپنے وجود کو آواز میں بدل دیا ھے۔

حمایت علی شاعر



اشاریہ و فرہنگ

(مرتبہ)
جاوداں میر
(ریسرچ اسکالر - پی ایچ - ڈی)
شعبۂ ثقافتِ اسلامی و تقابلِ ادیان
سندھ یونیورسٹی

ہر لفظ کی ایک روح ہوتی ہے جو صدیوں کے
مسلسل ارتقاء سے گذرتی ہے۔

شیخ ایاز

(الف)

(ت)

(ج)

(چ)

(خ)

(د)

(ڈ)

(ر)

(ش)

(ط)

(ق)

(ک)

(ل)

(م)

(ن)

(و)

(ھ)



براہ کرم درست کرلیجیے

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۰	۸	مہمان	مہان
۴۹	۲	ہیں	ہے
۶۸	۱	ٹھہر	ٹھیر
۷۹	۱	یادوں میں گولیج	یادوں میں، یوں گونج
۲۱۰	۶	کوئی ہرن ہو جو ...	کوئی ہرن جو ...
۲۷۶	۱۲	میں	سے
۲۷۶	۱۷	تلنگو	تلگو
۲۷۸	۱۴	بہرہ	بہرا
۲۷۹	۱۴	پہ	پر
۲۸۰	۱۲	ایک	دوسرا
۲۹۷	۸	پر	پہ
۲۹۹	۱۴	beaten	bitten
۳۰۲	۸	پورے	تمام
۳۰۵	۱۰	اطہر	احمد
۳۰۵	۲۰	نامو	نامور
۳۰۶	۳	مر کے	مرے
۳۱۱	۷	تکنک	تکنیک

(سطر چھوٹ گئی ہے)

۳۱۱	۱۲ کے بعد		اس دور کے ایک دوہے کا ترجمہ یہ ہے
۳۱۵	۱۶	باالخصوص	بالخصوص

صفحه	سطر	غلط	صحیح
۳۲۳	۵	معیاد	میعاد
۳۳۱	۲۱	میں نے پہلے کہیں	میں نے اس مضمون میں پہلے کہیں....
۳۳۸	۱۶	کہ	کے
۳۳۹	۱۳	ایاز کی شاعری	ایاز کی سندھی شاعری
۳۴۰	۱۸	عنائیت	غنائیت

نوٹ

موهن جو دڑو ــ موئین جو دڑو ــ موهیں جو دڑو

(مختلف محققین اسے مختلف انداز میں لکھتے ہیں)



اسان جا ايندڙ ڪتاب

١- Chronological Dictionary of Sind

٢- Economy of Modern Sind

٣- ١٩٧٣ع کان ١٩٧٩ع تائين ڇپيل سنڌي ڪتابن جي ببليوگرافي

٤- سائونڊ سيڪشن ۾ گڏ ڪيل مواد جو ڪئٽلاگ

٥- سنڌالاجيءَ جي لائبرريءَ ۾ موجود قلمي نسخن جو تشريحي ڪئٽلاگ

٦- سنڌي شاعريءَ تي فارسي شاعريءَ جو اثر

٧- خدا يار خاني ميان سرفراز خان عباسي

٨- چونڊ سنڌي مضمون ۽ مقالا

٩- بين الاقوامي اقتصاديات (ٻيون ڇاپو)

١٠- سنڌي ناول جي ارتقا

١١- تنقيدون

١٢- قاضي خادم جي ڊرامن جو مجموعو

١٣- ششماهي سنڌي ادب



SOLE AGENT

ALMAS BOOK HOUSE

Inverarity Road,

Post Box No. 10471

Saddar, Karachi-3



ADABIYAT

Tilak Incline, Hyderabad Sind.